

گردش



ڈاکٹر عبدالرب کھٹی

پیش لفظ

داستان گوئی ہو یا ناول نویسی۔۔۔۔۔ ہر دور میں طویل اور مختصر افسانوں اور کہانیوں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایک ہی نشست میں پڑھی جانے والی کہانی کا اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔ ایک کہانی کو تحریر کرنا گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ جس طرح چھوٹی چھوٹی مسرتوں میں ایک انوکھی خوشی کا لطف ہوتا ہے بالکل اسی طرح طویل اور مختصر کہانیوں کا ایک الگ ذائقہ ہوتا ہے۔

”گردش“ میرے ناولوں کے بعد۔۔۔۔۔ پہلا طویل اور مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے یکجا کرنے کا بیڑا محترم ناصر اقبال مجاہد صاحب نے اٹھایا ہے۔ جو خود بھی صرف ایک ناشر ہی نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ۔۔۔۔۔ حساس اور باشعور قاری ہیں۔

موصوف کو میری ایک مکمل کہانی ”دریا“ نے خاصا انسپائر کیا ہے انہوں نے میری دیگر چند تحریروں کو پڑھا اور مجھ سے فرمائش کر ڈالی کہ ”بھٹی صاحب! اخبارات اور ڈائجسٹوں میں چھپنے والی تحریروں کی تو کوئی زندگی نہیں ہوتی نہ یہ تحریریں زیادہ دیر تک منظر عام پر رہتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن کتاب تو عمر جاوداں کا درجہ رکھتی ہے، آپ ہمت کریں تاکہ اب تک آپ کے جتنے بھی مختصر اور طویل افسانے اور ناولٹ ہیں ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔“

سو یہ میرا پہلا مجموعہ قارئین کی نظر ہے وہی اس کی پسند اور ناپسند کا حق رکھتے ہیں ایک ادیب تو اپنی تحریروں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا جس روز وہ اپنی تخلیق اور اپنی تحریر سے مطمئن ہو گیا اس کی وجدانی موت واقع ہو جائے گی اور تخلیق کا عمل رک جائے گا۔۔۔۔۔ اللہ حافظ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جیکب آباد (سندھ)

دریا

ساٹھی تیار تھی۔۔۔۔۔

چاولوں کی کٹی ہوئی فصل کو سینٹ کے ایک بڑے سے پتھر پر پیٹا جا رہا تھا اس عمل سے اناج ایک طرف اور پھونس کو مقدور بھر علیحدہ کیا جا رہا تھا۔ اطراف میں دور تک پھیلے ہوئے چاولوں کے اس کھیت میں متعدد خاکستری پیٹھوں والے مدقوق سے ہاری جن میں عورتیں اور جوان العزلڑ کیاں بھی شامل تھیں، ٹولیوں کی صورت، بڑی تندہی کے ساتھ جفاکشی میں مصروف تھیں۔ حالانکہ اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے والا تھا مگر جفاکشی سے ان محنت کشوں کے چہرے پسینے سے تر بہر ہو رہے تھے اور ویسے اندرون سندھ کے دیہی علاقوں میں قیامت خیز گرمیاں مسلسل عذاب جاں بنی چٹی رہتی تھیں اور مشکل سے ہی جان چھوڑتی تھیں۔ حتیٰ کہ اس وقت سورج بھی سروں پر مسلط آگ

برساتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کھیتوں میں کام کرنے والے یہ سب لوگ گوٹھ کے ایک بااثر وڈیرے رئیس جابر خان کے دھاک (کھیت مزدور) تھے۔

مذکورہ گوٹھ وڈیرے رئیس جابر خان کے پردادا و سند خان کے نام سے موسوم تھا، جو دادو جانے والی انڈس ہائی وے سے تقریباً پندرہ سو کلومیٹر دور لاڑکانہ کے نواح میں واقع تھا۔ اس کے جنوبی قرب میں راس کینال کا سبک روپانی چھوٹی چھوٹی کاریزوں کے ذریعے آس پاس کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ یہ گوٹھ تین چار سو نفوس پر مشتمل تھا جہر بابا اللہ یار کی آٹا پیسنے کی چکی کے علاوہ ایک گورنمنٹ ڈسپنسری، پرائمری اسکول اور میڈیکل اسکول بھی تھا۔ آبادی کے وسط میں ایک مسجد بھی تھی۔

اس وقت کھیتوں میں کام کرنے والے ان جھاکش ہاریوں میں ایک غریب ہاری حسین بخش کا بھی خاندان تھا اور حسین بخش خود، اس کی بیوی مائی مختاراں اور جوان بیٹا محمد پتل بھی ساٹھی میں مصروف تھے۔ یہ درحقیقت ایک تھری خاندان تھا اور ان کا تعلق تھر کے ایک ریگستان گوٹھ ”منٹھی“ سے تھا۔ وہاں آئے دن پڑنے والے قحط اور خشک سالی کی وجہ سے دیگر باشندوں کی طرح یہ بھی وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آن بسا تھا۔

ہاری حسین بخش کی اپنے پورے خاندان سمیت یہاں آباد ہونے کی ایک سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ یہاں ”گوٹھ و سند خان“ میں ایک عرصے سے اس کا بڑا بھائی سکھو بھی اپنی بیوی عنایتاں اور بیٹے سرمد کے ساتھ رہتا تھا اور درحقیقت اپنے بڑے بھائی سکھو کے ایما پر ہی حسین بخش نے اپنے پورے کنبے سمیت یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ حسین بخش کی ایک سترہ سالہ جوان بیٹی سونی بھی تھی۔ وہ اپنے بھائی محمد پتل سے دو سال ہی چھوٹی تھی۔ عموماً وہ گھر پر ہی رہتی تھی۔ اپنی بھابھی ریشماں کے ساتھ۔۔۔۔۔ پتل سے اس کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے مگر ہنوز اس کی گود بلکہ فی

الوقت کو کھٹ تک خالی تھی۔

آغاز میں حسین بخش اپنے کنبے سمیت سکھو کے دو تنگ و تاریک کوٹھری نما گھر میں ہی رہتا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے وڈیرے رئیس جابر خان سے اجازت لینے کے بعد ایک چھوٹے سے قطع زمین پر کچی اینٹوں پر گارے مٹی اور بھوسے کا لیپ کر کے اپنا الگ سے دو کمروں کا گھر بنالیا تھا۔ اس میں بھی سکھو کی کوششوں اور محنت کا دخل تھا کیوں کہ اس نے اور اس کے بیٹے نے از خود تعمیر میں اس کا ہاتھ بٹھایا تھا۔ شہروں کے مقابلے میں دور افتادہ گوٹھوں کے مکانات بالکل سادہ اور آسان طرز تعمیر کا نمونہ ہوتے ہیں کہ خود ہی لوگ اپنی مدد آپ کے تحت کٹی، بھوسے اور مٹی کا گارا تیار کر کے، البتہ کچی اینٹیں ذرا خریدنا پڑتی ہیں جو گوٹھ کے بھٹے سے ادھار پر بھی مل جایا کرتی تھیں پھر دن رات ایک کر کے چار دیواری قائم کر دی جاتی اور سادہ سے کوٹھری نما کمرے ڈال دیے جاتے تھے۔ ان میں ضرورتاً کمینوں کے ساتھ چند ایک مزدور بھی شامل کر لیے جاتے تھے۔ باقی ماندہ چھوٹا موٹا ضروری سامان مثلاً دروازے اور کھڑکیوں کی چوکھٹ وغیرہ شہر سے خرید لیے جاتے تھے۔ ذریعہ معاش کا مسئلہ بھی سکھو نے حسین بخش وڈیرے کی زمینوں کی دھاک کی دلا کر حل کر ڈالا تھا۔

حسب دستور موسم کی فصل اترنے پر انہیں آدھا حصہ مل جایا کرتا تھا، جس میں یہ لوگ کچھ حصہ اپنے لیے محفوظ کر دیتے تھے اور بقیہ حصہ شہر کی منڈی میں لے جا کر ”بھلڑوں“ کو فروخت کر آتے تھے۔ فصل کا آدھا حصہ تو بس نام تھا وگرنہ ان بے چارے غریب ہاریوں کو آدھا بھی کب ملتا تھا۔ بیج، یوریا حتیٰ کہ ڈھل (ٹیکس) بھی ان ہاریوں کو ہی بھرنا پڑتا تھا۔ اس پرستم یہ کہ کمیشن کی صورت میں دو تین من اناج، وڈیرے جابر خان کا حریص منشی میرو پہلے ہی کاٹ لیتا تھا۔ کسی کی کیا مجال جو ذرا بھی صدائے احتجاج بلند کرتا۔ وہ جانتے تھے اس طرح انہیں نہ صرف مزدوری سے ہاتھ دھونے پڑتے بلکہ بے گھر بھی ہونا پڑتا مگر حسین بخش ہاری کے بیٹے پتل کو یہ

”بابا! ہم محنت کرتے ہیں، ہم حق رکھتے ہیں کہ اپنی مرضی سے جو دیں وہ اسے قبول کرنا ہے۔۔۔۔۔ تاکہ ہمیں۔۔۔۔۔“ پنل نے قدرے جوش بھرے لہجے میں کہا تو اس کا باپ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔

”دیکھ میرے بڑھاپے کا ہی خیال کر لے۔ مت لگ اس مردود کے منہ مجھے تو اب تیرے سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔“ باپ کی بات پر ہمیشہ کی طرح پنل دانت پیس کر خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دور مشرق کی سمت افق پر شام کے سرخی مائل سنائے اترے ہوئے تھے بلندو بالا ہنگ اور کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ کے اوپر دن بھر کے تھکے ماندے پرندوں کی ترتیب وار مست حال ڈاریں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ فضا میں آمد سرا کی ہلکی ہلکی بخ بنگلی اترنے لگی تھی۔ مٹرا اور چنوں کے کھیتوں کے درمیاں سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈی پر نازک اندام سوئی پانی سے بھرے دو گھڑے اٹھائے چلی آرہی تھی ایک گھڑا اس کے سر پر دھرا تھا جب کہ دوسرا اس نے اپنی پچلی کمر کے قیامت خیز لوچ میں ٹکا رکھا تھا۔ اس نے مخصوص روایتی قسم کا تھری لباس پہن رکھا تھا۔ تانبے جیسی رنگت پر پہلی چھری چمکتا ہوا گیر واگھا گھرا اور شوخ رنگ کی چولی نے اس کے حسن کی سادگی و پرکاری کو ایک عجیب سی کشش بخشی ہوئی تھی۔ کانوں میں چاندی کے بالے اور کندنی کہنیوں تک پلاسٹک کے سفید کڑے اور ستواں ناک پر دیکتے ہوئے ابلق نے اسے بالکل ایک خوب صورت اور ثقافتی نمونہ بنا ڈالا تھا۔ اس کی رنگت شہابی تھی البتہ اس کی بڑی بڑی سرکیں اور گہرائی لیے ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں مومن جوڈو کی سی اداسی تھی۔ وہ قدرے تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک بد ہیبت سا شخص اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

سوئی اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور رک گئی۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی سوئی کے

بات گراں گزرتی تھی۔ لیکن وہ باپ کی تنبیہ کی وجہ سے خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا مگر اس بار جب فصل اچھی اتری تھی۔ محمد پنل نے کہہ رکھا تھا کہ وہ منشی کو ایک بوری سے زیادہ ہرگز نہیں دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے قریب ہی درانتی چلاتے باپ کی طرف کن آنکھوں سے دیکھا اس کے بعد وہ خود فصلوں کے بیج سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی اجرک سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے قریب ہی زمین پر پچھی رتی پر آن بیٹھا یہاں صراحی رکھی تھی۔ جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس سے پانی انڈیل کر پینے لگا گلاس کے افق سے ایک ٹک مگر گھمبیر نظریں دور ایک منحنی سے شخص پر مرکوز تھیں۔ اسے دیکھ کر محمد پنل کی آنکھوں میں نفرت کے سائے لہرا گئے۔ یہ منشی میرو تھا جو اس وقت رجسٹر بغل میں دبائے اپنے چند مسلح حواریوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے والے ہاریوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی گول گول عدسوں والی عینک کے عقب میں حریصانہ چمک صاف عیاں تھی۔ گلاس صراحی کے اوپر الٹا رکھ کر پنل دانت پیسنے لگا اسے معلوم تھا کہ ان ہاریوں میں بے چارے وہ افراد بھی تھے جو ڈیرے کی نجی جیل کے قیدی تھے۔ ان کو خود ساختہ قرضوں اور سودور سود کی زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا۔ اٹائے راہ اس کا باپ حسین بخش بھی آ گیا۔ اس کے بدن پر صرف میلی چیکٹ ”راک“ (تہبند) تھی۔

”پپو! اس بار ہم منشی کو صرف ایک بوری گندم دیں گے۔“ حسین بخش پانی پیتے پیتے چونک کر اپنے کڑیل بیٹے کے گرم جوش چہرے کو تنکے لگا۔ وہ اپنے بیٹے کی اس بات سے انجانا سا خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

”ناں پت! ایسا مت بول۔ منشی میرو بڑا کمینہ آدمی ہے۔“ وہ سرگوشی میں دور کھڑے منشی میرو کی طرف دیکھ کر بیٹے سے بولا۔

”اس نے اگر وڈے سائیں سے شکایت کر دی تو اس سے بھی جائیں

گے۔“

معصوم سے چہرے پر پہلے لحظہ بھر خوف اور پھر انتہائی نفرت خیزی کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ بدہیت سا شخص بھی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے بھدے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ لیے اس کی جانب گھورے جارہا تھا۔

”میرا رستہ کیوں روکا ہے۔۔۔۔۔ ہٹ پرے۔“ سوئی نے ترخ کر قدرے حقارت سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”اڑی چھو کری! غصہ کیوں کرتی ہے؟ ایک بار میری بات سن لے پھر نہیں آؤں گا تیرے آگے۔“ اس نے معنی خیز خباثت سے کہا۔

یہ دادن تھا۔ دبی ہوئی اقامت مگر جتنے کے لحاظ سے نیل ہی معلوم ہوتا تھا رنگت اس کی اٹلے توے کی سی سیاہ تھی۔ سوئی کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا۔ غصے کی تپش اور اوپر سے دوپانی سے لبالب بھرے گھڑوں کے بوجھ نے اس کی سانس پھلا دی تھی۔ وہ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔

”میں کہتی ہوں، ہٹ جا میرے رستے سے ورنہ۔۔۔ ورنہ میں تیری شکایت ادا نل سے کر دوں گی۔ وہ کلہاڑی سے تیرے ٹوٹے کرڈالے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا مگر دادن پر اس کی دھمکی کا مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا ڈھٹائی کے ساتھ بڑی اوباشانہ نظروں سے سوئی کے حسین سراپے کو غوری گھورتے ہوئے لو فرپن سے بولا۔

”اڑی او۔۔۔۔۔ چھو کری! تیرا بھائی کیا میرے ٹوٹے کرے گا۔ ٹوٹے تو تیری حسین جوانی نے پہلے ہی میرے کرڈالے ہیں۔“ سوئی اس کی اس بات پر بری طرح تلملانے لگی۔

”شکل دیکھی ہے اپنی آئینے میں۔ میں کہتی ہوں ہٹ آگے سے۔“

”نہیں ہٹوں گا۔“ وہ ہٹیلے سے بولا۔

”تجھے آج میری بات سننا ہوگی۔“

وہ اس کی بات تو کجا اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی مگر اس نے کڑے دل سے سوچا کہ آج روز روز کی ڈہنی اذیت سے چھٹکارا پائی لینا چاہیے چنانچہ وہ چپکی کھڑی رہی مگر اس کے چہرے پر ہنوز نفرت بھری پرچھائیاں طاری تھیں۔ دادن اسے خاموش کھڑا دیکھ کر دل ہی دل میں خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بولا۔

”بس۔۔۔۔۔ یہ کہنا تھا سوئی کہ مجھ میں کیا برائی ہے۔ اچھا کھانا پیتا ہوں زمینوں کا مالک ہوں۔ تو اگر مجھ سے شادی کر لے تو رانی بنا کر رکھوں گا تجھے۔“

”بس۔۔۔۔۔ یا اور کچھ؟“

”اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہ کہ۔۔۔۔۔ میں تیرا جواب سننا چاہتا ہوں۔ تو عیوض کی ذرا فکر نہ کر۔ تیرے ماں پیکو اتنا روپیہ دوں گا کہ ساری زندگی آرام سے گزاریں گے۔“

سوئی کی فطرت دوسری سیدھی سادی لڑکیوں سے مختلف تھی اور نہ ہی وہ ڈری سہمی رہنے والی لڑکی تھی۔ اس نے آٹھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں۔ تعلیم نے اسے سنوارا تھا اسے شعور عطا کیا تھا۔ وہ اپنا برا بھلا بہتر طور پر سمجھتی تھی۔ اس نے آج دادن کو آڑے ہاتھ لینے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا چنانچہ اس نے خاموشی سے پانی کا مٹکا زمین پر رکھا دادن کھڑا امید بھری نظروں سے اس کی طرف تنکے جارہا تھا۔ اس کے بعد سوئی نے جلتی سلگتی نظروں سے دادن کے بدہیت سیاہ روچہرے کی طرف گھور کر نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

”میں نے تیری بات سن لی اور اب تو بھی آخری بار میری بات کان کھول کر سن لے۔ اپنے گھر جا اور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ انسانوں والی زندگی بسر کر بڑھاپے میں یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے۔ رہی میری تجھ سے شادی کی بات تو میں تیرے سے شادی کرنے سے زیادہ بہتر زہر کھا کر مرجانا پسند کروں گی۔ اب دوبارہ میرے راستے میں آنے کی جرأت نہ کرنا۔ ورنہ تیرے جیسے بد معاش آدمی کی بے عزتی کرنے

میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کروں گی۔“ یہ کہہ کر سوئی نے غصے سے بھناتے ہوئے منکا اٹھا کر دادن کے قدموں کے قریب دے مارا اور پاؤں پختی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
احساس ذلت کے مارے دادن کے مکروہ چہرے پر وحشتیں اٹھ آئیں اور وہ معاندانہ نظروں سے سوئی کو جاتے دیکھتا رہا۔
”تیرا غرور جلد توڑ دوں گا چھو کر!“ وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔

☆.....☆.....☆

سرمہ کھیتوں سے تھکا ہارا گھر پہنچا۔ وہ اپنے چچا زاد بھیل کا ہم عمر ہی تھا اور اس جیسا کڑیل اور گھبرو جوان تھا مگر بھیل کے برعکس وہ ٹھنڈے دماغ کا ایک سیدھا سادہ جوان تھا۔ جھگڑے فساد سے دور ہی بھاگتا تھا اور اپنے بڑوں کی لکیر والی فقیری اختیار کیے ہوئے تھا۔

گھر خالی تھا۔ ابھی اس کے ماں باپ کھیتوں سے نہیں لوٹے تھے البتہ سرمہ اپنا کام معمول سے ذرا جلد نمٹا کر واپس آ گیا تھا۔ گھر گاڑے مٹی کی کچی دیواروں پر مشتمل تھا جس میں دو کمروں کے نام پر کچی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کچا صحن البتہ خاصا کشادہ تھا جہاں ایک طرف چارہ کترنے کی ”کتر مشین“ اور وہیں قریب ہی ناند کے قریب ایک بدنما چھپر تلے کھری کے پاس ایک دو دھیل بھینس بھی بندھی ہوئی تھی ایک مرغی چوزوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ کڑکراتی پھر رہی تھی۔ سرمہ نے ایک کونے میں لگے ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھویا پھر اپنے کاندھے پر دھرے انگوچھے سے منہ ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے داہنی جانب والی دیوار پر بنی ایک چھوٹی سی کھڑکی کی طرف دیکھا جو اس کے چاچے ہاری حسین بخش کے گھر کے صحن میں کھلتی تھی کھڑکی بند تھی۔ یہ ایک آدم گزار کھڑکی تھی جس کے چوبیس چوکھٹے میں کوئی گرل یا سلاخیں نصب نہیں تھیں۔ معاً کھڑکی کے دونوں پٹ واہوئے اور سوئی کا من موہنا چہرہ ابھرا۔ وہ وہاں سے سرمہ کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اسے دیکھ کر سرمہ کے دل

کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہونے لگی۔ وہ شرمیلے انداز میں دیکھ کر مسکرایا اور پھر صحن میں پچھی کھری چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”ارے سرمو! وہاں کیوں بیٹھ گیا ہے؟ ادھر آناں!“ سوئی نے بڑے دلارے سے اس سے کہا۔ سرمہ ذرا گھبرا گیا۔ سوئی کھنکتی ہوئی آواز میں ہنسی پھر جیسے اس کی گھبراہٹ کی وجہ جان کر بولی۔

”آ جا ادھر میرے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔“ سرمہ کو ذرا اطمینان ہوا تو وہ چار پائی سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گیا۔

”سرمو! اتنا ڈرتا کیوں ہے رے! آخر کو ہم دونوں۔۔۔۔۔“
سوئی نے ایک ادائے دلربائی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ذرا شرمیلے انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ مگر سرمہ اس کی ادھوری بات کا مطلب جان کر بولا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔ یہ اچھا نہیں لگتا ابھی۔“
”کیا اچھا نہیں لگتا؟“ وہ اٹھلا کر بولی پھر ایک ادائے دل آرا سے اس نے اپنی چمکیلے پراندے والی چھن چمن کرتی چوٹی کو پشت سے سینے پر پھنکارا اور اس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

”ہم کیا کرتے ہیں؟ کیا تھوڑی سی باتیں بھی نہیں کر سکتے ایک دوسرے سے۔۔۔۔۔؟“

”کیا بات کریں؟“ سرمہ ہونفوں کی طرح اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ سوئی کو اس کے بھول پن پر بے اختیار ہنسی آ گئی بولی۔

”تو تو بالکل بھولا ہے۔ اچھا سن! یہ بتا تجھے میں اچھی لگتی ہوں؟ سرمہ نے اس کی بات پر ایک نظر چوکتی ہوئی اس پر ڈالی پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے فوراً سر ہلا دیا۔
”یہ کیا۔۔۔؟ زبان نہیں ہے تیرے منہ میں جو یوں سر ہلا دیا۔“

--- آگے بڑھ۔“ دونوں مرغے بھی شاید اپنے اپنے مالکوں کی ہلہ شیری کی زبان خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر دونوں نے اچھل اچھل کر اپنے نوکیلے پنچوں اور ٹھونگوں سے ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ میدان میں ایک بار پھر لوگوں کے ہم چچ کا شورا بھرا۔ پھر اچانک دادن کے راکٹ کو کا دو موالی کے لانچر پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس کے انگوٹھے پر چڑھے ہوئے فولادی نیش نے لانچر کی ایک آنکھ نکال دی۔ بس پھر کیا تھا کا دو موالی کا مرغا میدان چھوڑ کر بھاگا۔ دادن کے حواریوں نے بہ آواز بلند اس کے راکٹ کے حق میں نعرے بلند کرنا شروع کر دیے اور پھر دونوں خشتیوں (دادن اور کا دو موالی) نے یک دم آگے بڑھ کر اپنے اپنے مرغوں کو پکڑ لیا۔

”چل رے کا دو! نکال۔۔۔ دو ہزار روپے۔“ دادن نے پڑمردہ سے کھڑے کا دو موالی سے کہا اور پھر اس نے اپنی میلی چیکٹ صدری سے ہزار کا ایک میلا پکیلا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

”یہ ہزار لے لے باقی بھی میں دے دوں گا۔“

”نہیں۔ مجھے ابھی دے شرط کے پورے پیسے۔ میں تجھے ایسے میدان سے نہیں جانے دوں گا۔“ دادن فوراً لڑنے مرنے پر اتر آیا۔ ناچار کا دو موالی نے اپنی راک (تہبند) کی ڈب سے پانچ پانچ سو کے مزید دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے اور اپنا سامنہ لے کر اپنے راستے پر ہولیا۔ وہاں موجود دادن کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا اور بابل خان کے چہرہ ہوٹل پر دودھ پتی پلانے کا اصرار کرنے لگے دادن خوش تھا۔ وہ اپنے راکٹ (مرغ) کو اپنی بغل میں دبائے پیار کر رہا تھا پھر وہ بولا۔

”اڑے بابا! تم سب بابل کے ہوٹل میں چلو میں اپنے راکٹ کو ذرا مرہم اور دوا دے کر کے آتا ہوں۔“ اس کے حمایتی نعرے لگاتے بابل خان کے ہوٹل چلے گئے۔

”تو اور کیا کروں۔۔۔۔؟ تو نے پوچھا میں اچھی لگتی ہوں میں نے ہاں کہہ دی۔“ سرمد نے ہولے سے کہا تو سوئی بولی۔

”تو بھی پورا دھچر ہے! زبان سے بول کتنی اچھی لگتی ہوں تجھے؟“ سوئی بھی اسے چھوڑنے والی کہاں تھی۔ سرمد بھی جیسے جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

”اچھا بابا! تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔۔۔ اب بس!“

”سرمد تجھ سے ایک بات کہوں؟“ سوئی نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”کون سی بات؟“ وہ مستفسر ہوا۔

”بس رہنے دے!“ کچھ سوچ کر سوئی چپ ہو گئی۔ اچانک دروازے پر

آہٹ ابھری۔

”چل بند کر اب کھڑکی لگتا ہے بابا اور اماں آگئے ہیں میں چلا“ سرمد نے جلدی سے کہا اور پھر واپس چار پائی کی طرف بڑھ گیا۔ سوئی نے جلدی سے بے آواز کھڑکی بند کر دی۔

☆.....☆.....☆

دو مرغ آپس میں لڑ لڑ کر لہو لہان ہو رہے تھے اور ان کے گرد جنگٹھا بتائے لوگ انہیں بہ آواز بلند ہلہ شیری دے رہے تھے مگر ان میں دو افراد زیادہ پر جوش اور سرگرم دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کا دو موالی اور دوسرا دادن۔

”واہ رے میرے راکٹ! بھگا دے دشمن کو۔۔۔۔ آگے بڑھ۔۔۔۔ ہوڑ۔۔۔۔ ہوڑ۔۔۔۔ دشمن!“ دادن نے جوش سے پھرے ہوئے اپنے مرغ کو ہلا دیا۔ اس کے مرغ کا میدان نام راکٹ تھا۔ مخالف سمت میں کھڑے اپنے ساتھیوں کے آگے کھڑے منحنی سے خاکستری رنگ اور لمبوترے چہرے والے کا دو موالی نے بھی اپنے مرغ کا جوش بڑھاتے ہوئے چلا کر کہا۔

”شاباش میرے لانچر! آڑا دے دشمن کو۔۔۔۔ بھگا دے دشمن کو

دادن اپنے گھر پہنچا۔ گھر اگرچہ کچی دیواروں پر مشتمل تھا مگر کافی کشادہ تھا دو بڑے کمرے اور ایک چھوٹا کوٹھری نما کمرہ تھا۔ یہ اس کے راکٹ کے لیے مخصوص تھا صحن کے وسط میں ایک رلی بچھی چار پائی پر ایک فریبا اندام عورت بیٹھی تھی جو چار پائی پر دراز دس بارہ سال کے ایک بچے کے سر پر برف کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ بچہ بخار سے پھنک رہا تھا اور عورت جو اس کی ماں تھی۔ عالم پریشانی اور غم سے نڈھال زیر لب بدبوار ہی تھی۔ وہ خدا سے بچے کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ یہ زلیخا تھی دادن کی بیوی۔ وہ اپنے حلیے سے دکھوں کی پوٹلی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بچے کی تیمارداری اور بے آرامی کے باعث خود وہ بھی نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ تیس پینتیس کے لیٹے میں تھی۔

”اڑے رمضو کے پو! تجھے ہماری پرواہ بھی ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ اپنے شوہر دادن کو دیکھ کر جلدی سے چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تجھے اللہ سائیں کا واسطہ میرے بچوے (بچے) کو حکیم سائیں کے پاس لے جا اس کا تاپ (بخار) نہیں ٹوٹ رہا۔“

دادن نے خشمگین سی نظروں سے اسے گھورا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر پستوں کی ڈھیری نکال کر مرغ کے آگے رکھ دی۔ مرغاً جلدی جلدی اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر چونچیں مار مار کر پتے کھانے لگا۔ دادن اسے مصروف کرنے کے بعد اپنی بیوی سے بولا۔

”موسیٰ بخار ہے۔۔۔ اتر جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کوٹھری میں آ گیا مرغے کو آہستگی سے نیچے اتار پھر ایک چھوٹے سے بکے سے مرہم پٹی کا سامان نکال کر مرغے کو مرہم لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر صحن سے گزرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا تو اس کی بیوی زلیخا ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی اور روہانے لہجے میں التجا کر کے بولی۔

”تھوڑے پیسے تو دے دے۔ رمضو کو حکیم کے پاس لے جاؤں کتنے دنوں سے گریب بخار میں تڑپ رہا ہے۔“ دادن نے اسے کرخت نظروں سے گھورا پھر جیب سے دس کا مڑا ترا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ پھر باہر نکل گیا۔ بیچاری زلیخا کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے دس کے میلے کھیلے نوٹ کو دیکھتی کبھی مرغے کی کوٹھری کی طرف۔

☆.....☆.....☆

دادن بابل خان کے چھپر نما ہوٹل پہنچا تو اس کے یار باش حمایتی اس کے کھاتے میں دودھ پتی پینے میں مشغول تھے۔ دادن نے ایک پیش گار چھو کرے کو جیب سے سوکا کرارا نوٹ نکال کر تھما دیا اور پھر وہاں سے سیدھا نشی میرو کے ہاں پہنچا دادن کو یقین تھا کہ نشی میرو اس وقت اپنے گھر میں ہوگا۔ نشی میرو سے اس کے پرانے مراسم تھے۔ اس نے دادن کو اوطاق میں بٹھا دیا۔

”چائے پانی کا بندو بست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر نشی اوطاق کے ایک دوسرے صحن میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو دادن نے منع کرتے ہوئے کہا۔

”اڑے بابا رہنے دے چائے میں پی کر ہی آ رہا ہوں۔ ادھر آ۔۔۔ ذرا بیٹھ میرے ساتھ آج تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ نشی میرو خاموشی سے اس کے سامنے والی ایک کھری چار پائی پر بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے دادن کے پرسوج چہرے کی طرف تکتے لگا۔ پھر دادن اس سے بولا۔

”یار نشی میرو! تو ہی کچھ میرے مسئلہ کا حل بتا اور میری مدد کر۔“

”اڑے بابا! بتا تو سہی کیا مسئلہ ہے۔“ نشی نے پوچھا۔

”ارے یار! وہ ہاری حسین بخش ہے نا۔۔۔۔۔ اس کی دھی سوہنی پر میرا دل آ گیا ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بتایا تو نشی کے منحنی چہرے

پر خباثت بھری مسکراہٹ ابھری۔

”اچھا! یہ بات ہے؟“ وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر سنگ لے لے۔۔۔۔۔ جا کر حسین بخش سے اس کی دھی (بیٹی) کا۔“

”ہاں۔ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ دادن پر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے

بولا۔

”پر میں کیسے جاؤں؟ یہ کام تو کر دے۔ بھر جائی (منشی کی بیوی) کو تو ساتھ

لے جانا میرا کام ہو جائے گا تو دونوں کے سوٹ پکے۔ شہر سے لے کر آؤں گا مٹھائی

بھی۔“ دادن نے اسے لالچ دیا۔ منشی بھی ایک کاٹیاں تھا کہ دادن نے اس مشکل کام

کے لیے اسے ہی کیوں چنا تھا کہ رئیس کا منشی ہونے کی وجہ سے حسین بخش پر ذرا رعب

پڑے، اس لیے وہ بھی مکاری سے بولا۔

”یار دادن! بس صرف دو سوٹ اور مٹھائی۔۔۔ سوئی جیسی پری کے لیے تو

تجھے اپنی جیب بھی ڈھیلی کرنی پڑے گی۔“

”اچھا اچھا! سمجھ گیا تیرا مطلب؟ تو تو میرا پکا یار ہے، فکر نہ کر۔۔۔۔۔ نوٹ

بھی دوں گا۔“ دادن نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

”اچھا! عیوضہ کتنا طے کروں؟“ منشی نے دادن سے پوچھا۔

”بہی پچاس ہزار۔“

”یہ تو بہت تھوڑا ہے۔“ منشی میرو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ایک لاکھ کی بات کرے تو کام کی کچھ امید بن سکتی ہے۔“ دادن اس بات

پر کچھ سوچنے کے بعد رضامند ہو گیا۔

”اور میرے پندرہ ہزار تیار رکھنا۔۔۔۔۔ میں چلا۔“ وہ اٹھنے لگا۔ دادن بھی

کھڑا ہو گیا۔

”مجھے منظور ہے۔۔۔۔۔ بس تو یہ کام کر دے میرا۔“

بے فکر رہ۔۔۔۔۔ میں آج ہی اپنی زال (بیوی) کے ساتھ حسین بخش کے گھر جاتا ہوں۔“ منشی نے اسے تسلی دی۔ دادن خوش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

منشی میرو اور اس کی بیوی کو اپنے پیوند زدہ دروازے پر دیکھ کر بے چارہ ہاری

حسین بخش آنکھیں پھاڑے غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”سائیں! آپ نے تو ہمارے گھر کو بڑی رونق بخش دی اس گریب کی

عزت ہو گئی۔۔۔۔۔ آؤ۔ آؤ۔۔۔۔۔ بھلی کرے آئیو۔“

صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ گھر میں اتفاق سے سب

ہی موجود تھے سوائے محمد پتل کے۔ حسین بخش نے منشی اور اس کی بیوی کے لیے فوراً

صحن میں چار پائی بجھائی اور پھر صاف ستھری رتی ڈال دی اور اپنی بیوی مختاراں سے

چائے پانی کا کہا تو منشی اسے منع کرتے ہوئے بولا۔

”کسی شے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ ادھر بیٹھ۔ تیرے سے ایک ضروری

بات کرنا تھی حسین بخش!“

حسین بخش بے چارہ حیران و پریشان ایک ٹک منشی میرو کا چہرہ تکتے لگا۔

اسے حیرت سے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی کہ آخر رئیس جابر خان کا منشی میرو اس غریب

کے ہاں چل کر ایسی کون سی اہم بات کرنے آیا ہے جو اس نے اپنے کسی رئیس کی

اوطاق میں بلا کر کرنے کی بجائے خود اس کے گریب خانے میں آیا ہے۔

”منشی صاحب! مجھے بلا لیا ہوتا آپڑیں اوطاق میں۔۔۔۔۔ تم نے کیوں

تکلیف کی؟“ حسین بخش نے فروتنی سے کہا۔

”اڑے بابا! ایک ہی بات ہے۔۔۔۔۔ پریشان مت ہو تو۔۔۔۔۔ سن

ذرا۔“ منشی میرو نے مکارانہ انیسیت سے کہا پھر بولا۔

”تو بھی کیا یاد کرے گا کہ تیری دھی سوئی کے نصیب کھولنے آ گیا ہوں

میں۔“ اس کی بات پر حسین بخش کبھی منشی کا منہ تکتا تو کبھی اپنی بیوی مختاراں کا منہ دیکھنے لگتا۔

”میں سمجھا نہیں منشی صاحب!“ وہ منشی سے الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

تو منشی میرو نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”سیدھی بات ہے۔۔۔ اچھا سن دادن کو تو جانتا ہی ہے ناں۔۔۔ خاصا پیسے والا ہے اور شریف بھی۔ بڑا سیدھا سادہ آدمی ہے۔ میرا تو یار ہے پکا۔۔۔ اس کے لیے میں تیری دھی سوئی کا رشتہ لینے آیا ہوں۔۔۔ بول اب کیا کہتا ہے۔“ اس کی بات سن کر بے چارے حسین بخش پر یکدم سکتا طاری ہو گیا۔

خاصی دیر تک غریب کے منہ سے کوئی الفاظ تک ہی نہ برآمد ہو سکے۔

”پورے ایک لاکھ دے گا۔۔۔ دادن۔۔۔ تیری دھی عیش کرے گی اور سکھی رہے گی اس کے پاس۔“ منشی اسے شاید خوشی کے مارے گم دیکھ کر بولا۔

حسین بخش سے ابھی کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔ وہ اسے کیا جواب دیتا بلکہ وہ تو یہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں اس کا جوان بیٹا نسل نہ آجائے۔ وہ تو پہلے ہی منشی پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اس پر اگر اسے یہ پتہ چل جاتا کہ منشی جہاں خود بہ نفس نفیس چل کر کیا کرنے آیا تھا تو کوئی بعید نہ تھا وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ کیونکہ وہ ہی کیا پورا گوٹھ دادن کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا وہ کس قماش کا آدمی تھا یہ بھی پورا گوٹھ جانتا تھا۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ کیا جواب دوں دراصل سس۔۔۔ سائیں وہ۔۔۔ میں نے سوئی کی بات وڈے سکھیو کے بیٹے سرمہ سے طے کر دی ہے۔“ اسے بالآخر یہی جواب سوچا تھا۔

”بات سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ میں تو سیدھے نکاح کی بات کر رہا ہوں۔“ منشی نے کہا۔ اس شخص کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ ہاری حسین بخش اسے کیا جواب دینے والا تھا۔ حسین بخش کے چہرے پر پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں آخر کار وہ

اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت سماجت سے بولا۔

”منشی صاحب! ہم گریب لوگ ہیں۔۔۔ ہمارا دادن جیسے زمیندار سے بھلا کیا جوڑ؟ میرے بڑھاپے پر رحم کر۔۔۔ ہمیں اپنے حال پہ مست رہنے دے۔“

”اڑے یار! تو ایسے ڈر رہا ہے جیسے۔۔۔“ منشی میرو نے ابھی اس تشفی آمیز انداز میں اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔ حسین بخش نے ٹھٹکی ہوئی نظروں سے وہاں دیکھا اور سن ہو کر رہ گیا۔ اس کا بیٹا محمد نعل اندر داخل ہو رہا تھا پھر جیسے ہی اس کی نگاہ منشی میرو پر پڑی۔ وہ ایک لمحے کو اپنی جگہ پر ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔ تیرے جواب کا انتظار کروں گا۔“ منشی میرو یہ کہہ کر وہاں سے کھٹکنے کے انداز میں چلا گیا۔

”بابا! یہ خبیث یہاں کیا کرنے آیا تھا؟“ نعل نے خاصی ناگواری کے ساتھ باپ سے پوچھا۔ حسین بخش ایک دم گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

”ایسے ہی آیا تھا۔ فصلوں کی کٹائی کا پوچھ رہا تھا۔ کتنے جریب تک ہو گئی ہے۔“ وہ بیٹے سے جھوٹ بولنے پر مجبور تھا مگر سوئی میں ماں کے ساتھ دم بہ خود بیٹھی سوئی نے باپ کا جھوٹ پکڑ لیا اور فوراً سوئی سے باہر نکل آئی پھر باپ سے بولی۔

”بابا جھوٹ کیوں بولتا ہے۔۔۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتا ادا کو وہ خبیث بڑھا تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“ باپ نے غصے سے بیٹی کو گھورا۔

”چل جا اندر۔۔۔ باتوں میں کان لگائے رکھتی ہے۔“ پھر وہ بیٹے سے جبراً مسکرا کر بولا۔

”چل پٹ! تو مانی ٹکر کھالے۔ تھکا ہوا ہے۔“

”نہیں بابا کوئی بات ہے۔۔۔ تو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ پہلے بتا۔ وہ مردود
 منشی میری وہاں کیوں آیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ ہمارے دروازے کے قریب سے بھی
 نہیں گزرتا تھا۔“ پتل نے باپ کو پکڑ لیا۔ حسین بخش نے ایک درشت نگاہ قریب کھڑی
 اپنی بیٹی سوئی پر ڈالی اور سوئی خاموشی کے ساتھ وہاں سے کھسک گئی۔ وہ اب مطمئن تھی
 کہ اس کا باپ اب اپنے غیرت مند بیٹے کے سامنے کچھ چھپانہ سکے گا۔ حسین بخش کو
 بھی یہ بخوبی علم تھا وہ بولا۔

”اچھا! اچھا بتاتا ہوں۔ پہلے تو مانی ٹکر (روٹی وغیرہ) تو کھالے۔“

”اصل بات کو سنے بغیر میں روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔“

پتل حسب عادت اڑ گیا۔ حسین بخش پریشان ہو گیا۔ پتل باپ کو متذبذب
 پا کر اس کے قریب آ گیا۔ باپ کو اصل بات بتانا ہی پڑی جسے سن کر پتل کا چہرہ سرخ
 ہو گیا۔ باپ نے فوراً اپنی ٹوپی اتار لی۔

”نہیں بابا! بہت ہو گیا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ پتل نے قہر آلود لہجے میں کہا
 پھر کلباڑی اٹھالی۔ باپ اس کے آگے آ گیا اور گڑ گڑا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”میرے بڑھاپے کا واسطہ۔۔۔ یوں غصہ نہ کر۔۔۔ اڑی
 او۔۔۔ پتل کی ماں۔۔۔ روک اسے۔۔۔ یہ ہم پر قیامت لانے والا ہے۔“

مختار اس بھی اپنے گھبرو بیٹے کو غیرت کی آگ میں سلگتا دیکھ کر اسے روکنے کو
 دوڑی مگر پتل ان کی پرواہ کیے بغیر آندھی طوفان کی طرح گھر سے نکل گیا اور سیدھا
 رئیس جابر خان کی اوطاق میں پہنچا۔ وہاں منشی میرا بھی ابھی پہنچا تھا اور ایک سرکنڈوں
 کے موڑے (مونڈے) پر رجسٹرڈ سنبھالے بیٹھا زمین پر پلیتھیاں مارے بیٹھے چند
 مدقوق ہاریوں سے کرخت لہجے میں مخاطب تھا۔ پتل کو دیکھتے ہی وہ بری طرح چونک
 پڑا۔ پتل کے چہرے پر بگڑتے تیور دیکھ کر وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”اڑے آ بابا چھو کر! کیسے آنا ہوا؟“

”منشی! تو نے جرأت کیسے کی اس حرام زادے جواری کی اولاد دادن کے
 لیے میری بہن سوئی کا سنگ (رشتہ) مانگنے کی؟“ پتل دروازے پر ہی نہنگ کے
 درخت کی طرح کھڑے کھڑے غصے سے غرا کر بولا تو اس بار منشی میرو کا دماغ بھی
 الٹ گیا اور وہ اپنی گود میں پھیلے ہوئے رجسٹر کو بند کر کے یک دم غصے سے بھانتا ہوا اٹھ
 کھڑا ہوا پھر عینک اتار کر اپنی چندی چندی مکارانہ آنکھوں سے پتل کو گھورتے ہوئے
 بولا۔

”اڑے چھو کر! زبان سنبھال کر بات کر۔۔۔ یہ آپڑیں وڈے سائیں کی
 اوطاق ہے۔۔۔۔۔ تیرا وڈھا نہیں ہے یہ۔“

”منشی باغیرت لوگوں کے لیے ایک غریب ہاری کے گھر کا وڈھا اور وڈے
 سائیں کی اوطاق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔“ پتل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
 شعلہ فشاں لہجے میں بولا۔

منشی میرو اس کی گرم جوش جوانی کا رروائی پر یک دم مارے طیش کے موڑھے
 سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصیلے لہجے میں پتل کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے دانت
 پیس کر بولا۔

”اڑے چھو کر! تو جس عزت کی بات کر رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی ہمارے
 رئیس کی دی ہوئی ہے۔۔۔ اور تو آج اس کی اوطاق میں آ کر مجھے لکار رہا ہے۔ اپنی
 اوقات میں رہ۔“

”منشی! یہ عزت ہمیں کسی انسان نے نہیں اللہ نے دی ہے اور مجھے رئیس کا
 ہی لحاظ آتا ہے جواب تک خاموش ہوں۔“ پتل نے غیظ آلود لہجے میں کہا۔

”اور کان کھول کر سن لے۔۔۔ تو بھی اپنی حیثیت صرف فصلوں کے
 حساب کتاب تک رکھ۔ اگر دوبارہ کبھی میری بہن کا نام بھی تیری زبان پر آیا تو میں
 رئیس کا بھی لحاظ نہ کروں گا۔“ یہ کہہ کے پتل واپس چلا گیا۔

ہنل زخمی شیر کی طرح بھرا ہوا وہاں سے سیدھا دادن کے گھر کی طرف چلا۔ راستے میں چاچا اللہ یار نے اسے بتایا کہ دادن بابل کے چھپر ہوٹل میں موجود ہے تو ہنل نے سیدھا وہاں پہنچ کر ہی دم لیا۔

”کچھ۔۔۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ میں اس ذلیل کے کو آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ پتل غیظ و غضب کے عالم میں غرایا اور چٹکھاڑتی آنکھوں سے دادن کو گھورنے لگا۔

”دادن!۔۔۔۔۔ کتے! میری بات کان کھول کر سن لے۔ دوبارہ میری بہن کی نگلے اٹھا کر بھی دیکھا تو کلہاڑی سے تیرے ٹوٹے کر کے رکھ دوں گا۔ آج تیری بچ گیا۔ ہر دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔“ پتل نے مغلوب الغضب ہو کر

یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ دادن سمیت وہاں موجود اس کیساتھی بھی دم بہ خود سے کھڑے رہ گئے۔ پھر ہنٹل قبر آلود نظروں سے دادن کو گھورتا ہوا پاؤں پٹخ کر وہاں سے واپس چلا گیا۔ ذرا دیر بعد بابل خان کا چھپر ہٹل لوگوں کی آپس میں چہ گوئیوں کے بم چچ سے گونج رہا تھا۔

سکھو اور حسین بخش نے اپنی ساری عمر ارضی ناخداؤں کے آگے ہاتھ جوڑے ”حاضر سائیں وڈا“ اور ”برابر سائیں برابر وڈا“ کر کے گزاری تھی۔ لہذا وہ ایسے لوگوں کی کینہ پرور عادات و خصلت سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ دونوں جہاندیدہ بھائی اب اندر سے ڈرے سہمے ہوئے تھے اب کبھی بھی ان پر کوئی بڑا اعتبار رئیس کی ناراضگی کی صورت میں نازل ہونے والا تھا کیوں کہ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ خمیٹ دادن نے رئیس میر کا دامن پکڑ رکھا تھا اور منشی رئیس کا دم چھلا تھا جو ان کے خلاف گل کھلانے کے لیے بظاہر خاموشی سے مکاری کی بلکل مارے بیٹھا تھا۔

27

سکھو نے اپنے بیٹے کی شادی سے صاف انکار کر دیا۔ حسین بخش اور اس کا بیٹا منل بھونچکارہ گیا۔ ایک لمحے کو تو انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا۔

”بھائی سکھو! ی۔۔۔۔۔ی۔۔۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ ہوش میں تو ہے؟“ حسین بخش نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔

اس وقت دونوں باپ بیٹا اور حسین بخش کی بیوی مائی مختاراں سکھو کے ہاں آخری بات طے کرنے آئی تھی کہ سکھو نے دھماکہ کیا۔

سکھو کا چہرہ اندرونی کرب کا غماز تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی عنایتاں بھی موجود تھی۔ ان کا بیٹا سرد البتہ باہر تھا۔ سکھو نے اپنے بھائی کی بات پر ایک آزدہ سی ہمکاری بھری۔ پھر سر جھکاتے ہوئے خیف سی آواز میں بولا۔

”ہاں بھائی!۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔سوئی کا سنگ (رشتہ) اپنے بیٹے سرمد کیلئے لینے سے صاف انکار کرتا ہوں۔“

”مگر چاچا! یہ تجھے اچانک کیا ہو گیا ہے؟ تو نے تو زبان دے رکھی تھی۔“ اس بار محمد منل نے لب کشائی کی۔ اس پر گم صم بیٹھے سکھو کی بیوی عنایتاں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پٹ منل! بس ہمیں سوئی کا رشتہ منظور نہیں ہے۔“

”ادی! یہ کیا بات ہوئی؟ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ منل کی ماں مختاراں نے غمناک پریشانی سے کہا تو سکھو پریشان کن لہجے میں بولا۔

”سمجھ تو ہماری بھی نہیں آ رہا بھرجائی!“ یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی سے منت بھرے لہجے میں بولا۔

”بھا! تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔ میں تیرا بڑا بھائی ہوں۔ پر میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔تو میری عمر کا سمجھ دار آدی ہے۔ میری مجبوری سمجھ گیا ہوگا تو۔۔۔۔۔بس اس بات کو ادھر ہی ختم کر دے۔ ہم نے بھی آخر زندہ رہنا ہے۔“ اس

کے ذومعنی دکھڑے کو جہانمیدہ حسین بخش فوراً سمجھ گیا۔ پھر وہ اپنی بیوی اور بیٹے سے بولا۔

”چلو واپس گھر۔“ یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ اس سے اگلے دن کا ذکر تھا۔ حسین بخش کو کھیتوں میں کام کرنے کے دوران رئیس جابر خان کے چند مسلح حواریوں نے فی الفور رئیس کی اوطاق میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ بے چارہ حسین بخش اسی وقت دل میں سو قسم کے اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ لرزتا کانپتا ہوا فوراً رئیس جابر خان کی اوطاق میں حاضری بھرنے جا پہنچا تھا۔

اوطاق خالی تھی۔ صرف چند مسلح حواری وہاں بیٹھے سگریٹ بیڑی پینے میں مصروف تھے۔ حسین بخش پر انہوں نے ایک اچلتی ہوئی نظر ڈالی اور بے چارہ ایک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خاصی دیر بعد ایک بھاری بھر کم اور نیم شیم شخص اوطاق میں داخل ہوا۔ یہ گوٹھ کا بااثر وڈیر رئیس جابر خان تھا۔ وہ ایک ساٹھ پاٹھ شخص تھا دراز قد بیش قیمت کاشن کی مکلف کڑکڑاتی ہوئی بے داغ شلوار قمیض پر واسکٹ اور ہالائی اجلی اجرک اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اذلی رعوت جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی وسمہ لگی گھنی داڑھی مونچھیں اور ہنٹوں نے اس کے مزاج کی کڑختی کو خاصا ابھارا ہوا تھا پاؤں میں چمڑے کی پشوری جوتے کوچہ چوں خروچوں پختہ فرش پر مارتا ہوا وہ ایک نسبتاً اونچے اور کشادہ پٹنے والے سرکنڈوں کے بنے موڑھے پر براجمان ہوا۔ اس کے عقب میں منشی میر وہمی رجسٹر تھا مے اندر داخل ہوا تھا۔

اوطاق میں یک دم جیسے درباری سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایک کونے میں دبکا کھڑا حسین بخش اندر ہی اندر ہول کھا رہا تھا۔ رئیس جابر خان نے موڑھے پر براجمان ہوتے ہی ایک خمکین سی نظر ماری حسین بخش پر ڈالی اور پھر دوسرے ہی لمحے اوطاق پر

طاری اسرار بھری خاموشی کو ایک پاٹ دار آواز نے چاک کر ڈالا۔

”اڑے حسین بخش ادھر آ۔“ جابر خان کی گونجیلی اور تحکمانہ آواز پر حسین بخش ہاتھ جوڑے لرزیدہ انداز میں چلتا ہوا ذرا قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”سوئی تیری ہی دھی ہے ناں؟“

”ہاؤ۔۔۔۔۔ سائیں وڈا!“ ہاری حسین بخش جلدی سے بولا۔

”میں نے سنا ہے تو اپنی دھی سوئی کا بیاہ آ پڑیں بھائی سکھو کے بیٹے سرمد سے کرنا چاہتا ہے؟“ رئیس نے نخوت بھرے لہجے میں کہا تو حسین بخش مرتعش سی آواز میں بولا۔

”س۔۔۔۔۔ سائیں وڈا! کرنا تو چاہتا تھا پ۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔ بھا سکھو نے اپنے بیٹے کی شادی میری دھی سے کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ اس کی بات پر رئیس کے بھاری بھر کم چہرے پر بڑی سنگین اور اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔

”ہوں! اس نے کافی عقلمندی دکھائی ہے اور اب تو بھی ذرا عقل سے کام لے۔“

”برابر سائیں بھوتار!۔۔۔۔۔ برابر۔۔۔۔۔ جیسا حکم ہو آپ کا۔“ ہاری حسین بخش نے فدویانہ لہجے میں بدستور اپنے ہاتھ جوڑ کر رئیس جابر خان سے کہا۔

”سن میری بات۔“

”جی سائیں میں سن رہا ہوں۔“

”آ پڑیں دھی سوئی کا بیاہ دادن سے کر دے۔ وہ بہت پیسے والا آدمی ہے تیری دھی سکھی رہے گی اس کے پاس۔ ہاں۔ بابا۔۔۔ کیا بولتا ہے اب تو؟“ رئیس نے جیسے مشورہ دینے کے انداز میں اسے حکم دیا اور حسین بخش سر سے پاؤں تک ایک الجھن آمیز سنگین پریشانی میں ڈوب گیا۔ رئیس جابر خان چند ثانیے اسے سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر کھر دے لہجے میں دوبارہ بولا۔

”اڑے بابا تو کس سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔۔؟“

”س۔۔۔۔۔ سائیں! دادن تو پہلے ہی شادی شدہ ہے اور اس کی عمر بھی دگنی ہے۔ بالآخر میری دھی اسکے ساتھ کیسے سکھی رہ سکتی ہے؟“ بالآخر حسین بخش نے ذرا ہمت کر کے کہہ ڈالا۔

”اڑے بابا! مرد اور گھوڑے کی کوئی عمر دیکھی جاتی ہے۔“ رئیس جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

بے چارہ حسین بخش کیا جواب دیتا چپ ہو رہا۔ پھر رئیس جابر خان کی خاموشی کو اپنے تئیں اس کی رضامندی جان کر دوبارہ کرکراتی آواز میں اس سے بولا۔

”ہاں بابا! ہمارا منشی اور اس کی بیوی کل تیری دھی (بیٹی) سوئی کو انگٹھی پہنانے آرہے ہیں اور اسکے چند روز بعد نکاح بھی ہو جائے گا۔“ حسین بخش اس کے حکم پر لرز کر رہ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”س۔۔۔۔۔ سائیں وڈا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“

”حسین بخش!“ رئیس اسے متذبذب پا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔

”انکار کرنے سے پہلے یہ سوچ لے کہ تو ہماری اوطاق میں کھڑا ہے اور ہمیں انکار سننے کی عادت نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا انکار تیرے پورے خاندان کے لیے جنجال بن جائے۔“ رئیس جابر خان کے گونج دار لہجے میں چھپی تہدید کو ہاری حسین بخش صاف محسوس کر کے اندر سے بری طرح کانپ گیا اور جلدی سے لرزیدہ آواز میں بولا۔

”برابر سائیں!۔۔۔۔۔ برابر۔“ یہ کہہ کر وہ منہ لٹکائے واپس چلا گیا۔

”سائیں بھوتار کے سر کی خیر ہو دے۔“ ہاری حسین بخش کے وہاں سے جاتے ہی رئیس جابر خان کے قریب بیٹھے منشی نے مکارانہ چالپوسی سے کہا۔

دیا۔

”سائیں ایک عرض ہے۔ آپ متعلقہ تھانے کے حوالدار حکم دادا کو ذرا اپنی اوطاق میں بلا لیں باقی کام آسان ہو جائے گا۔“

”حوالدار کو اسی وقت ہمارا پیغام دو کہ وہ ابھی ہماری اوطاق میں حاضر ہو۔“ رئیس جابر خان دانت کچکا کر بولا اور نشی سینے پر ہاتھ رکھے مکاری سے بولا۔

”برابر سائیں برابر۔“ اس کے ساتھ ہی وہ سامنے کھڑے دادن کی طرف مکروہ مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔ دادن نشی میرو کی سازش بھانپ کر شاطرانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

☆.....☆.....☆

سوئی کو اس سارے گورکھ دھندے کی بھٹک پڑ چکی تھی۔ آخر کو وہ بھی اس خاندان کی ایک فرد تھی۔ پھر وہ کیسے بے خبر رہ سکتی تھی کہ اس کے چاچا سکھیو نے اپنے بیٹے سرمہ کے لیے اچانک اس کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے مگر سوئی کو سب سے زیادہ دکھ سرمہ کی طرف سے تھا کہ کم از کم اسے اس کی بے لوث محبت کا دم بھر لینا چاہیے تھا وہ کیوں بزدلوں کی طرح منہ چھپائے خاموش بیٹھا تھا۔ اسے سرمہ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ مرد ہو کر اس قدر مجبور تھا۔ ایک روز اس نے سرمہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس وقت سوئی کی ماں مختاراں گھر پر نہ تھی اور سرمہ اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ سوئی نے اپنی اجرک کی چادر سنبھالی اور بے دھڑک سرمہ کے گھر جا گھسی۔ سرمہ اسے تنہا پا کر ایک لمحے کو چونک سا گیا۔

”سرمو! تو کیسا مرد ہے! تو نے۔۔۔ تو نے۔۔۔ تو نے۔۔۔“ رئیس جابر خان اور اس مردود دادن کے دباؤ میں آ کر مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔۔۔ کیوں؟ کیا میری محبت اتنی سستی تھی؟“ سوئی نے غصے اور غم ناک سے جوش میں کہا۔
تو سرمہ نے حسب عادت کھیانے لہجے میں گول مول جواب دیا۔

”ہاری حسین اپنے بیٹے پنل سے بہت خائف ہے۔ پنل ضرور اس کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا ناں سائیں! کہ اس دو ٹکے کا چھوکر ہل اس سلسلے میں غصے سے لال پیلا ہو کر یہاں آیا تھا۔ ویسے بھی سائیں وڈا! اس چھوکرے کا بڑا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جب بھی فصلوں کی بٹائی کا وقت آتا ہے وہ ہمارے دوسرے دھاکوں (کھیت کے مزدوروں) کا دماغ خراب کرتا ہے کہتا ہے کہ محنت ہم کریں اور آدھی سے زیادہ فصل رئیس لے جاتا ہے۔ کامریڈ بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے اس کے سر پر۔“ اس نے بڑی چالاکی سے رلاملا کر رئیس کے کان بھرے۔

”ہوں!“ اس کی بات پر رئیس نے غیر مرقی نقطے پر اپنی گھورتی نظریں مرکوز کرتے ہوئے غصے سے ہمکاری لی۔ پھر سنناتے لہجے میں بولا۔
”اس چھوکرے کی یہ مجال! اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“ اس کے لہجے میں اچانک ہی خوفناک سفاکی در آئی تھی۔ معادادن اوطاق میں داخل ہوا۔
”سائیں وڈا! قہر (غضب) ہو گیا۔ آج اس چھوکرے پنل نے بائل کے ہوٹل میں میری سخت بے عزتی کی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ نشی میرو نے میری بہن کا رشتہ لانے کی جرات کیوں کی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ آپ کو بھی برا بھلا کہہ رہا تھا۔“ دادن نے رئیس کو درغلا یا۔ رئیس یک دم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دھاڑا۔
”نشی!“

”حاضر سائیں بھوتارا!“

”اب سب سے پہلے اس چھوکرے پنل کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“
”برابر سائیں! برابر۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ خیر! میں ایسا کام کروں گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔ بس! آپ کا حکم ہو؟“ نشی مکاری سے بولا اور سائیں جابر خان نے غصے سے دانت پیٹتے ہوئے اثبات میں سر ہلا

”میں نے تھوڑا ہی شادی سے انکار کیا ہے۔ وہ تو بابا نے انکار کیا ہے؟“
 ”شادی تو نے مجھ سے کرنی ہے یا تیرے بابا نے!“ سوہنی نے فطری سرکشی سے بھنا کر کہا اور سرد بے چارہ اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔

”دیکھ سرمو! مرد بن میں تجھے چاہتی ہوں۔ میری محبت کی قدر کر لوگ تو اپنی محبت کے لیے سرتک لڑا دیتے ہیں مگر تو کیسا مرد ہے؟ بزدل ہے تو دادن کے سامنے اپنا منہ دبا کر بیٹھ گیا ہے۔“ اس کی بات پر سرمو نے عجیب سی نظروں کے ساتھ سوہنی کی طرف دیکھا۔ پھر حتمی لہجے میں بولا۔

”سوہنی! میں اپنے ماں باپ کی بات رد نہیں کر سکتا۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ چلی جا یہاں سے۔“ اس کی بے اعتنائی پر سوہنی کی سرگیں آنکھوں میں بے اختیار کرب و اندوہ کے آنسو نکل آئے، جسے وہ فوراً پیتے ہوئے ہونٹ چبا کر استہزائیہ لہجے میں بولی۔

”ہاں، مجھے واقعی چلے جانا چاہیے۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ میں اب تک کسی مرد سے نہیں بلکہ ایک بزدل سے محبت کیے ہوئے تھی۔ تو تو محبت کے قابل ہی نہیں ہے۔ یہ میری غلطی تھی جو تجھے دل دے بیٹھی، مٹھ۔۔۔“ حقارت آمیز انداز میں سوہنی پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

”سائیں وڈا! آپ بے فکر رہیں۔ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔“ رئیس جابر خان کی اوطاق میں بیٹھے ایک پختہ عمر تو ندیل سے حوالدار حکم دادنے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک سالم بھنے ہوئے پھوڑ کو دانتوں سے بھنبھوڑتے ہوئے فدیوانہ لہجے میں کہا اور اس کے سامنے والے کشادہ موڑھے پر براجمان جابر خان کی گھنی مونچھوں پر سفاکانہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ اس کے قریب ہی دو موڑھوں پر بیٹھے منشی میر واور دادن بھی دانت نکالنے لگے۔ ان کے وسط میں ایک شیشے کی ٹاپ والی

میز پر ولایتی شراب اور آئس کیوب کے علاوہ بڑی سی ٹرے پر بھنے تیز سالم رکھے ہوئے تھے اور حوالدار حکم دادن دیدے پن سے اپنے سامنے دھرے ان لوازمات آوارہ کو تکے جارہا تھا۔

”سن لیا منشی اور دادن تو نے بابا!“ حوالدار حکم داد کے گویا گرین سنگل دکھانے پر رئیس جابر خان نے سرسراتے لہجے میں ان دونوں سے کہا تو وہ دونوں رئیس کے معنی خیز لہجے کا مطلب فوراً بھانپ کر بولے۔

”برابر سائیں!۔۔۔۔۔ برابر۔۔۔۔۔ ہم سمجھ گئے۔“

”اب تمہارا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔“

”ہاؤ سائیں بھوتار! ایک تیر دو شکار۔۔۔۔۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔“ منشی میر و نے مکاری سے مسکرا کر لقمہ دیا اور رئیس جابر خان ہولے ہولے اپنے سر کو تھیبی جنبش دینے لگا۔

☆.....☆.....☆

بظاہر حالات معمول پر آ گئے تھے مگر معمول کے ان خاموش حالات میں کیسا مصائب بھرا طوفان چھپا ہوا تھا اس کا اندازہ جہاندیدہ سکھو اور ہاری حسین بخش ہی کو تھا۔ سوہنی کا دل البتہ سرمو سے خراب ہو چکا تھا۔ پتل اپنے تئیں دادن کو مزہ چکھا چکا تھا اور رئیس جابر خان کے لاڈلے منشی میر و کو بھی دھمکا چکا تھا۔ وہ اب مطمئن تھا کہ اتنی بے عزتی کے بعد یہ دونوں خبیث پھر کبھی اس کی معصوم اور پھول سی بہن سوہنی کا سنگ (رشتہ) مانگنے کی کوشش نہیں کریں گے، مگر وہ ارضی نا خداؤں سے واقف نہ تھا جن کے سارے غلط فیصلے اس کے لیے ”صحیح“ ثابت ہوتے تھے۔ وہ جبر و استبداد کے زور پر جیتے تھے۔ نا انصافی کی چکی تلے غریبوں کو پیس کر اپنے خود ساختہ فیصلوں کو اثبات میں بدلنے کے عادی تھے۔

ایک روز اچانک چاچا سکھو غصے میں بھرا ہوا اپنے بھائی ہاری حسین بخش

کے گھر داخل ہوا۔ اس وقت یہ سب گھر میں ہی موجود تھے۔ سکھیو نے گھر میں داخل ہوتے ہی پتل کا گریبان پکڑ لیا اور ساتھ ہی اسے ایک عدد تھپڑ بھی جڑ دیا۔ پتل حیرت سے گنگ رہ گیا۔ اس کا باپ حسین بخش بھائی کو سنبھالنے کے لیے لپکا۔

”اڑے بھائی سکھیو خیر تو ہے۔۔۔۔۔ پاگل تو نہیں ہو گیا، جو میرے جوان پٹ (بیٹے) پر ہاتھ اٹھا رہا ہے؟“

”تیرے اس جوان پٹ نے میرے سیدھے سادے پٹ (بیٹے) سرمہ کے ساتھ بد معاشی کی ہے۔“ سکھیو نے غصیلے لہجے میں اپنے بھائی سے کہا اور پتل سے بولا۔

”بتا رے چھوڑا! تو نے کیوں میرے پٹ سرمہ کو اپنے دوستوں سے پٹوایا ہے۔۔۔۔۔ بول۔۔۔۔۔ کیا اسے لاوارث سمجھا تھا تو نے؟“

”چاچا! آرام سے بات کر، مجھ پر تو کبھی میرے پو (باپ) نے بھی ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔ میں بھلا سرمہ کو دوستوں سے کیوں پٹواؤں گا۔“ پتل کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان سکھیو کے ہاتھ سے چھڑایا۔ سب پریشان ہو گئے۔

”میں خوب جانتا ہوں! میرے فرماں بردار پٹ سرمہ نے تیری بہن سے شادی سے جوا نکار کر دیا ہے اس لیے تو نے اسے اپنے بد معاش دوستوں سے پٹوایا ہے میں ابھی تھانے میں جا کر تیرے اور تیرے بد معاش ساتھیوں کے خلاف رپٹ (رپورٹ) درج کروانا ہوں۔“ سکھیو غصے کے مارے بکنا جھلکتا چلا گیا۔

وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ پھر جلدی انہیں لوگوں سے پتہ چلا کہ چند کلباڑی بردار ڈھانٹا پوش چھو کروں نے سرمہ کو خوب مارا پیٹا تھا اور لوگوں نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ میرے دوست پتل کی بہن سوہنی سے منگنی توڑنے کا انجام ہے۔۔۔۔۔ زندگی چاہتا ہے تو اپنا فیصلہ واپس لے لے اور سوہنی کا سنگ

(رشتہ) قبول کر لے۔ وہ بد معاش چھو کرے زخمی سرمہ کو دمکی دے کر چلے گئے۔

القصہ کوتاہ۔۔۔۔۔ پتل کو گرفتار کر لیا گیا۔ حسین بخش روتا ہوا اپنے بھائی سکھیو کے پاس پہنچا اور پہلے قسمیں کھا کھا کر اپنے بیٹے محمد پتل کی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا پھر جب سکھیو نہ مانا تو اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھ منڈا بھرا!۔۔۔۔۔ مجھے یہ سازش لگتی ہے۔۔۔۔۔ تو نے میری دھی سوہنی سے آپڑیں پٹ سرمہ کی منگنی توڑ ڈالی۔ میں نے برا نہیں منایا۔ کیوں کہ میں تیری مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسا تو نے رئیس جابر خان کے خوف سے کیا ہے۔ پھر دیکھ! میں اپنے پٹ کو چنگی طرح جانتا ہوں بلکہ تو بھی تو اسے جانتا ہے۔ وہ بھلا کبھی آپڑیں بھائی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے؟“

اس کی بات سکھیو کے دل کو لگی اور یوں بات آئی گئی ہو گئی۔ پتل جیل سے چھوٹ کر آ گیا۔ بات ختم ہو گئی۔۔۔۔۔ مگر وہ سادہ لوح نہیں جانتے تھے کہ ارضی نا خداؤں کے لیے تو ابھی بات شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے محمد پتل کو اس کی غیرت مندی کی سزا دینے کے لیے جس سازش کا تار عنکبوت تیار کیا تھا اسے اب کسنے کا وقت آچکا تھا۔

☆.....☆.....☆

محمد پتل کے جیل سے چھوٹنے کو آج دوسرا ہی دن تھا کہ کسی نامعلوم قاتل نے سرمہ کو بندوق کا نشانہ بنا کر قتل کر ڈالا۔

سرمہ کے قتل پر پورا گونٹھ تھرا اٹھا۔ سکھیو کے ہی نہیں بلکہ حسین بخش کے گھر میں بھی کھرام مچ گیا۔ گونٹھ میں تیزی سے یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ یہ قتل محمد پتل کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ سرمہ کے قتل سے چند دن پہلے ہی پتل نے اپنی بہن سوہنی کی منگنی توڑنے کی سزا دینے کے طور پر سرمہ کو اپنے بد معاش دوستوں سے بری طرح پٹوایا تھا۔ ان افواہوں کو ارضی نا خداؤں کے کار پردازوں نے مزید ہوا دی

تھی۔ نتیجتاً محمد ہنل کو آٹا فانا سرمد کے قتل کے شبے میں پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے بوڑھے غریب ماں باپ اور بیوی ریشماں جوان بہن سوئی روتے پیٹتے رہ گئے تھانیدار حکم داد جواب رئیس جابر خان کا راتب خوار بن چکا تھا۔ اس نے ہنل کا چالان کر کے اسے فوراً لاک اپ کر دیا۔

دونوں گھرانوں میں کہرام مچ گیا تھا۔ سکھیو اور اس کی بیوی عنایتاں اپنے اکلوتے بیٹے سرمد کے قتل پر پچھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سرمد ان کے بڑھاپے کا واحد سہارا تھا۔ ادھر ہاری حسین بخش اور اس کی بیوی مائی مختاراں اپنے کڑیل اور غیرت مند بیٹے محمد ہنل کی گرفتاری پر ماتم کناں تھے۔ ہنل کی جوان بیوی ریشماں نے تو رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کی بہن سوئی بھی آرزوہ تھی۔ ارضی نا خداؤں کی سازش کامیاب ہو چکی تھی۔

ہاری حسین بخش روتا پیٹتا ہوا رئیس جابر خان کی اوطاق میں پہنچا اور اس کے قدموں میں گر پڑا۔

”س۔۔۔ سائیں وڈا! میرے بچڑے کو بچالو۔ وہ بے گناہ ہے۔ وہ غصے والا جوان ضرور ہے مگر میں جانتا ہوں وہ کسی کا خون کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس کی داد فریاد پر رئیس جابر خان نے غصیلے انداز میں اس سے کہا۔

”تیرا بیٹا خونی ہے۔ اس سے پہلے دادن کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ بابل خان کے ہوٹل میں موجود لوگوں نے اگر ہنل کو نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ سرمد کی طرح دادن کو بھی جان سے مار ڈالتا۔ پھر اس نے ہماری اوطاق میں آ کر ہمارے فشی میر کو بھی دھمکیاں دیں۔ اس کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ اب اسے پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

بوڑھا حسین بخش بے چارہ کانپ اٹھا۔ لرزیدہ لہجے میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”س۔۔۔ س۔۔۔ سائیں وڈا! رحم۔۔۔ رحم سائیں وڈا!“

”اڑے بابا! یہ قانونی معاملہ ہے ہم کچھ نہیں کر سکتے؟“

”نہیں سائیں! آپ یہاں کے وڈے بھوتار ہو۔ تھانیدار حکم داد آپ کا دوست ہے۔ میرے بچے کو چھڑا دو سائیں! وہ قاتل نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر غریب رونے لگا۔ رئیس جابر خان نے اپنے قریب بیٹھے فشی میر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور ہولے سے سر ہلاتے ہوئے رئیس جابر خان نے بالآخر ہاری حسین بخش سے کہا۔

”سنو حسین بخش! ہم ایک شرط پر تمہاری مدد کرنے کی کوشش کریں گے؟“
”حکم سائیں! حکم۔۔۔! مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔۔۔“ حسین بخش نے بے اختیار امید نبرے لہجے میں کہا۔ اس کی بوڑھی غم زدہ آنکھوں میں ایک ایسی آس کے چراغ جل اٹھے تھے۔ رئیس جابر خان نے کرکراتے لہجے میں کہا۔

”اگر تو اپنی دھی سوئی کا بیاہ دادن سے کر دے تو تیرا ہنل جیل سے چھوٹ سکتا ہے۔“ رئیس کی بات پر حسین بخش دم بہ خود رہ گیا۔ وہ بے بس اور مجبور تھا۔ ہنل اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ پھر وہ جلدی سے رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

”سائیں! مجھے یہ شرط منظور ہے۔“ اس کی بات پر رئیس اور فشی نے ایک دوسرے کی طرف کامیاب مسکراہٹ سے دیکھا۔ پھر رئیس نے ہاری حسین بخش سے کہا
”جا پھر پہلے سوئی کی دادن سے بیاہ کی تیاریاں کر! تیرا بیٹا ہنل جلد چھوٹ کر واپس آ جائے گا، مگر اس سے پہلے تجھے سوئی کو دادن کے ساتھ رخصت کرنا ہو گا ورنہ تیرا جو شیلا بیٹا پھر رنڈک ڈالنے کی کوشش کرے گا۔“

”برابر سائیں!۔۔۔ برابر۔۔۔۔۔ میں ابھی جاتا ہوں۔“ ہاری حسین بخش نے کہا اور سیدھا اپنے گھر پہنچا اور اپنی بیوی مائی مختاراں کو بھی یہ بات بتائی جب سوئی نے یہ سنا تو وہ کانپ اٹھی۔

دادن جیسے رذیل اور بد ہیئت بوڑھے سے شادی کا مطلب زندہ درگور ہونا

نیم دائرے کی صورت میں بیٹھا تھا۔

وسط میں تھوڑے فاصلے پر سوئی بے سدھ لٹی تھی مگر ہوش میں آتے ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی اور اب متوحش نگاہوں سے ان سب کے چہرے کے کچے جا رہی تھی۔

”اڑے یار سنگت خیرل! چھو کری تو یہ ڈاڈھی سو نہڑیں ہے۔۔۔۔ کیا خیال ہے پھر۔۔۔؟“ معا بکن دھاڑیل نے حینانہ مسکراہٹ سے پرہوس لہجے میں سوئی کو گھورتے ہوئے خیرل سے کہا تو بے چاری سوئی اس کی معنی خیز ادھوری بات کا شیطانی مقصد سمجھ کر لرز اٹھی۔ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر دہانے لہجے میں بولی۔

”مم۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہوں۔“

”باہا ہٹھیک ہے پھر ہم جو ہیں تمہارا سہارا بننے کے لیے۔“

بکن دھاریل نے بھنویں اچکاتے ہوئے شیطانیت سے کہا۔ اس کے ساتھیوں نے واشگاف قہقہہ لگایا، البتہ بکن دھاریل کا نائب خیرل جس کا پورا نام دھاریل خیرل سندھو تھا۔ چپ بیٹھا ڈری سہی سوئی کو تکتے جا رہا تھا۔

”نن۔۔۔۔ نہیں۔ مجھ پر یہ ظلم نہ کر۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں
م۔۔۔ مجھے جانے دو۔“ یہ کہہ کر سوہنی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر رات
اپنے آخری چہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اندر ایک کونے میں بدہیت بانس کے ساتھ
لائٹیں جھول رہی تھیں۔

سوئی کے اٹھتے ہی بکن دھاڑنیل نے درشت لہجے میں غراتے ہوئے اس سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ چھو کر! ایسا نہ ہو وقت سے پہلے ہی ہم تیری مٹی پلید کر دیں۔ تجھے آج رات ہماری ملکہ بننا ہوگا۔ آج رات ہم تیرے ساتھ جشن منائیں گے۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔“ اس کی دیکھا دیکھی اس کے ساتھیوں نے بھی شیطانی تمہیے لگانا شروع کر دیے اور تب سوئی نے جیسے ابلیس صفت سرغنہ بکن

دھاڑیل کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی ہوس کو بھانپ لیا اور پھر اس کی فطری سرکشی بیدار ہونے لگی۔ اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے ڈر و خوف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کچن دھاڑیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”اے شیطان! اللہ سائیں کے عذاب سے ڈر!۔۔۔ ایک بے بس اور مجبور لڑکی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے تجھے شرم آنی چاہیے۔ لعنت ہے تیری مردانگی پر اور تیرے لمبے چوڑے وجود پر۔“

گوٹھ کی ایک سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی کے لکارنے پر ایک لمحے کو تو بکن دھاڑیل جیسا سفاک شیطان دم بہ خود رہ گیا۔ پھر جیسے دوسرے ہی لمحے اس کی خوف ناک آنکھوں میں درندگی کی چمک عود کر آئی اور وہ غصے سے غرا کر اٹھا پھر آگے بڑھتے ہوئے سوئی کو بالوں سے پکڑ کر اس کی نازک صراحی دار گردن کو جھٹکا دیا تو سوئی کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ سی نکل گئی۔

”سور کی بچی! ابھی تجھے اپنی مردانگی دکھانا ہوں۔“ لیکن دھاڑیل نے خونخوار لہجے میں کہا اور پھر وہاں موجود سوائے اپنے نائب خیرل سندھو کے سب کو باہر نکل جانے کا اشارہ کیا پھر سب کے جاتے ہی لیکن دھاڑیل پر ہوس نظروں سے سوتنی کے روتے بلکتے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے سر سے اجرک کی چادر کھینچ لی دھاڑیل خیرل سندھو بظاہر خاموش کھڑا تھا مگر اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سوتنی نے بے بس اور رحم طلب نگاہوں سے لیکن دھاڑیل کے خونخوار چہرے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اپنے دونوں کپکپاتے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

”تیرے کو اللہ سائیں کا واسطہ! مجھ غریب ناری پر یہ ظلم نہ کر!“

مگر کہیں دھاڑیل پر اس وقت شیطان سوار تھا۔ اس نے اپنی زوسی ساختہ اے کے ۴۵ کلاشکوف ایک طرف پھینکی اور سوئی کے گرمیوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا

ہی تھا کہ اچانک اس کے نائب اور گروہ کے نمبر دوسرے دھاڑیل خیرل سندھو نے گونج دار آواز میں اپنے سرغنہ بکن دھاڑیل سے کہا۔

”سائیں وڈا! اس چھو کری کو چھوڑ دو!“ اس کی آنکھوں میں غیرت و جوش کی چمک کو سوتنی نے پڑھ لیا تھا۔ بکن دھاڑیل کا اس کے گریبان کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ یک لخت رک گیا۔ وہ ایک لمحے کو بت بنا کھڑا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نائب اسے روکنے کی جرأت بھی کر سکتا ہے۔ اس نے سوتنی کو چھوڑ کر اپنے نائب دھاڑیل خیرل سندھو کی طرف سنسناتی نظروں سے دیکھا پھر سنائے دار لہجے میں اس سے بولا۔

”خیرل! تو کب سے نامرد بن گیا ہے بڑے!“

”سردار سائیں! ایک مجبور اور بے بس لڑکی کی عزت خراب کرنا کہاں کی مردانگی ہے؟“ دھاڑیل خیرل سندھو نے غیرت بھرے لہجے میں اپنے سردار بکن دھاڑیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تو بکن دھاڑیل غصے سے پھنکار کر بولا۔

”یہ کیا بکواس کر رہا ہے بڑے خیرل! جانتا نہیں میں گروہ کا سردار ہوں۔“
”مگر میں تجھے ایک بے بس لڑکی کے ساتھ ایسا شرم ناک کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔“ یہ کہہ کر دھاڑیل خیرل سندھو آگے بڑھا اور زمین پر پڑی اجرک اٹھا کر سوتنی کے سر پر ڈھانپ دی۔

”اسے جانے دے سردار! اسے جانے دے!“ اس کے لہجے میں عجیب و بد بے عود کراہٹ آئی۔

مگر بکن دھاڑیل بولا۔ ”ہرگز نہیں! یہ میرا شکار ہے اور اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ میرے گروہ سے نکل جا!“

یہ کہہ کر اس نے سوتنی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دھاڑیل خیرل سندھو ایک دم

سوتنی کی ڈھال بن گیا۔ دونوں دھاڑیل آمنے سامنے تھے۔ دونوں ہی لمبے ترنگے اور لمبے شیم تھے۔ تب بکن دھاڑیل نے ایک زوردار گھونسا خیرل سندھو کے جڑے پر جڑ دیا۔ خیرل نے تکلیف کی پرواہ کیے بغیر اپنی لات چلا دی۔ بکن دھاڑیل چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ پھر وہ جیسے ہی زمین پر پڑی اپنی کلاشکوف اٹھانے بڑھا تو خیرل سندھو نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ سوتنی سراسیمہ انداز میں ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی اور دل ہی دل میں اس بھلے مانس دھاڑیل خیرل سندھو کی فتح کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سوتنی کو کسی غیرت مند مرد پر فخر محسوس ہو رہا تھا جو اس کے لیے لڑ رہا تھا جو اس کی عزت بچانے کے لیے اپنے سرغنہ سے جا بھڑا تھا۔ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر۔۔۔۔۔ اپنی جان اس کی خاطر جو حکم میں ڈال دی تھی۔ پھر ایک موقع پر اس نے دیکھا کہ شیطان صفت بکن نے کلاشکوف اپنے قبضے میں کر لی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ خیرل سندھو نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور زمین پر لوٹ لگتا ہوا اسیدھا بکن دھاڑیل کے پیروں سے ٹکرایا۔ بکن دھاڑیل لڑکھڑایا۔ خیرل سندھو نے اس کی قدموں میں لیٹے لیٹے اپنی ٹانگ اس کی رانقل والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ نتیجتاً رانقل بکن دھاڑیل کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ خیرل سندھو نے بکن دھاڑیل کو مزید سنہلنے کا موقع دیے بغیر دوسری لات اس کے پیٹ پر بھی جڑ دی اور بہ سرعت لوٹ لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ بہت خطرناک صورت حال تھی اور کسی ایک کی ہلاکت پر منتج ہو سکتی تھی دونوں ایک دوسرے سے رانقل چھیننے کے لیے اپنے پہاڑ جیسے وجود کی طاقت صرف کر رہے تھے۔ پھر بکن دھاڑیل نے اچانک خیرل سندھو کے پہلو پر اپنا گھٹنا جڑ دیا۔ اذیت کی ایک طوفانی لہر پورے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔ رانقل پر ذرا گرفت ڈھیلی پڑی۔ بکن دھاڑیل نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس

سے رانقل چھینی چاہی تو خیرل سندھو نے جھٹکے سے اپنی تکلیف کا بدلہ اپنے سر کی بھرپور ضرب اس کی ناک پر مار کر لیا۔ جو خاصی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ لیکن دھاڑیل کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ خیرل سندھو نے جھٹکے سے رانقل چھین لی اور اس کا رخ لیکن دھاڑیل کی طرف کر دیا۔ لیکن دھاڑیل کی آنکھوں کے سامنے موت کی زرد چمک لہرائی۔ خیرل سندھو نے اس شیطان کو ہلاک کر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بصورت دیگر وہ سوئی کو نہیں چھوڑتا چنانچہ اس نے لیلیٰ رہا کر دی۔ گولیوں کی بو چھاڑ نکلی اور لیکن دھاڑیل کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ سوئی دہشت زدہ ہو گئی۔ گولیوں کی آواز سن کر دوسرے دھاڑیل بھی اندر آ گئے۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے انہیں لاش اٹھانے کا حکم دیا۔ پھر باہر آ کر سرداری کا اعلان کر دیا۔

اس نے سرداری کا اعلان کرتے ہوئے پہلے ایک تقریر کر کے گروہ کے لوگوں کو بتایا کہ دھاڑیل لیکن نے گروہ کے اصولوں کے خلاف قدم اٹھایا تھا اور ایک مجبور و بے بس لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ یوں تو دھاڑیل خیرل سندھو کے گروہ میں حمایتیوں کی تعداد کم تھی مگر ان میں ایک دھاڑیل جانو جگری بھی تھا۔ وہ ایک کینہ پرور اور مارا آستین شخص تھا۔ اس نے نئے سردار خیرل سندھو کو دل سے گروہ کا سرغنہ نہیں مانا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ سابقہ دھاڑیل خیرل سندھو کا خیر خواہ تھا بلکہ دھاڑیل جانو جگری سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اونٹ کی طرح کینہ اپنی ناف میں چھپائے سردست خاموش ہی رہا تھا مگر اب وہ موقع کی تاک میں تھا کہ وہ نئے سردار دھاڑیل خیرل سندھو کو ایک کینہ پرور اونٹ کی طرح اپنی چنگی جیسی بھاری ناف تلے کھلتا ہے۔ بہر طور سرداری وغیرہ کا معاملہ نمٹانے کے بعد دھاڑیل خیرل سندھو الم نصیب سوئی کی طرف متوجہ ہوا۔

”تیرا نام کیا ہے؟“

”س۔۔۔ سوئی!“ اس نے مرتعش سی آواز میں اپنا نام بتایا۔

”کون ہے تو۔۔۔؟“

”میں۔۔۔۔ میں ایک گریب ہاری کی بیٹی ہوں۔“

”رات کے وقت تو کدھر بھاگ رہی تھی؟“

”وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ میرا باپ مجھے وڈیرے کے دباؤ میں آ کر ایک بوڑھے سے میری شادی کرنا چاہتا تھا اور میں بھاگ کر اپنی خالہ کے ہاں جا رہی تھی؟“

”ہوں! یہ واقعی تیرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔“ دھاڑیل خیرل سندھو نے متاثر کن لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سوئی اسے مدد طلب نگاہوں سے نکلنے لگی۔ وہ بولا۔

”مگر تیری خالہ تیرا تحفظ کیسے کرے گی؟ وڈیرے کے آدمی وہاں بھی تو پہنچ سکتے ہیں؟“

”اللہ کے آسرے پر یا کسی نیک اور بہادر انسان کی مدد پر۔“

سوئی نے اس بار صاف گوئی سے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں دونوں کے دلوں کے تارے بج اٹھے اور پھر سوئی نے بے اختیار اپنا سر جھکا لیا۔

دھاڑیل خیرل سندھو کو یہ معصوم سی پیاری لڑکی بہت بھائی تھی۔ پھر اس نے کسی خیال کے تحت جاننا چاہا اور گھمبیر آواز میں بولا۔

”مجھے تو کیسا انسان سمجھتی ہے؟“ اس کے اسرار بھرے استفسار پر سوئی نے ذرا چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر یک دم ہی نگاہیں جھکا لیں۔

”مجھ سے شادی کرے گی۔۔۔۔؟“ اچانک خیرل سندھو نے اس کا عندیہ لیا تو سوئی کے تفتہ دل کے تار بج اٹھے۔ اسے یہ بالکلا بھیلانہ جوان اچھا لگا تھا وہ تھا تو دھاڑیل مگر سوئی کو اس کی شرافت اور بہادری نے از حد متاثر کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر رضامندی کے اظہار کے طور پر اپنا سر جھکا لیا۔

”سوچ لے چھو کمری! میں ایک دھاڑیل ہوں۔ کیا تو ایک ڈاکو کی بیوی بننا پسند کرے گی؟“ دھاڑیل خیرل سندھو نے پھر پوچھا تو سوہنی اس کی طرف دیکھ کر بولی ”تو یہ دھندا چھوڑ کر شرافت کی روزی کیوں نہیں کماتا۔۔۔۔۔؟“

اس کی بات پر دھاڑیل خیرل سندھو کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ عود کر آئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

”سوہنی! میں نے بھی شرافت کی زندگی اور محنت کی کمائی سے روزی روٹی کمانے کی کوشش کی تھی مگر مجھے بھی ایک عام ہاری سے خطرناک دھاڑیل بنانے میں انہی مظالم و ڈیروں کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے میری معصوم بہن کو خوار کیا۔ اس بے چاری نے دل برداشتہ ہو کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میرے بوڑھے ہاری ماں باپ کو گھر سمیت زندہ جلا دیا گیا اور جب میں نے انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا تو قانون کے رکھوالوں نے جو آئے روز وڈیرے کی اوطاق میں بھٹ تیتروں کے سالم بھنے ہوئے پھٹور کی ضیافت اڑاتے، شراہیں پیتے، جشن پاڑیں کرتے، الٹا انہوں نے ہی مجھے گرفتار کر لیا اور یوں ظلم اور نا انصافی کے پاٹوں کی اس سفاک چکی میں پس کر میری زندگی کا ڈھب ہی بدل کر رہ گیا۔“ دھاڑیل خیرل سندھو اپنی ماضی کی مختصر درد آگیں کھٹکانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اپنے ماضی کی غیرت سوز داستان بیان کرنے کے بعد اس کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ سوہنی کو ایسے میں وہ ایک خطرناک دھاڑیل کی بجائے ایک الم نصیب اور دکھی انسان معلوم ہو رہا تھا جس نے اسے بھی متاثر کیا تھا وہ آگے بڑھی اور اس زخم خوردہ انسان کا گویا مرہم بن کر اس سے چمٹ گئی۔ دو یک جان دو قالب میں ڈھل گئے۔

پھر سوہنی نے بھی اسے اپنی ساری رام کہانی سنا دی کہ کس طرح اس کے غیرت مند بھائی محمد پتل کو سرد کے جھوٹے قتل کے الزام میں دادن اور مٹی میرو نے ملی بھگت کر کے رئیس جابر خان کے ذریعے گرفتار کر دیا تھا اور متعلقہ تھانے کا حوالہ حکم

داد پتل کو لمبی سزا میں پھنسانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دھاڑیل خیرل سندھو اس کی رام کتھا پر غصے سے دانت پیس کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے اب ایک اور شریف انسان دھاڑیل بنایا جا رہا ہے سوہنی! تیرا غم بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے تو بے فکر رہ۔ میں نے غریبوں کو لوٹنے کے لیے بلکہ ایسے ظالموں کو سبق سکھانے کے لیے یہ روپ بھرا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور شاید ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی۔“

☆.....☆.....☆

دونوں کی کہانی ایک تھی اور دونوں کے زخموں کی نوعیت بھی۔ حالات دگرگوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی صورت ملا دیا تھا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے سوہنی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی ضرورت مدد کرے گا اور جن لوگوں نے اسے راندہ درگاہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا عرصہ حیات تنگ کر دے گا۔ چنانچہ ایک رات دھاڑیل خیرل سندھو نے اپنے گروہ کے پندرہ ساتھیوں کو گوشہ کے متعلقہ تھانے میں شب خون مارنے کے لیے تیار کیا۔ تیز رفتار گھوڑوں پر یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سوہنی جنگل ڈیرے ہی میں موجود تھی۔ وہ خیرل سندھو کے کامیاب لوٹنے کی دعائیں مانگنے لگی۔

اپنے سردار دھاڑیل خیرل سندھو کی ہونے والی بیوی کی حیثیت سے گروہ کے لوگ سوہنی کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے اور اسے سردار ہی کی چھو الداری میں رکھا ہوا تھا اور خود اپنے سردار خیرل سندھو اور ساتھیوں کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ وہیں دو دو تین تین کی ٹولیاں بنائے بیٹھے آپس میں گفتگو میں مصروف تھے کچھ جنگل ڈیرے کی سرحد پر بہ طور پہرے داری کے متعین تھے۔ رات نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ تاروں بھرا آسمان روشن تھا۔ آخری تاریخوں کا چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا۔ ایک الگ تھلک گوشے میں مار آستین دھاڑیل جانو جگری اپنے چند ہم خیال

ساتھیوں کو سردار دھاڑیل خیرل سندھو کے خلاف ورغلا نے میں مصروف تھا۔
 ”خیرل سندھو نے ایک دو ٹکے کی چھو کڑی کی خاطر ہمارے سردار بکن
 دھاڑیل کو موت کے گھاٹ اتار کر اچھا نہیں کیا ہے۔“ وہ سرسراتی سرگوشی میں اپنے
 ساتھیوں کے مختصر ٹولے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”ہم پر اپنے سردار کا قرض ہے کہ ہم اپنا فرض نبھائیں۔“
 ”مگر جانو سائیں! اب کیا ہو سکتا ہے؟ خیرل سندھو تو اب گروہ کا سردار بن
 چکا ہے؟“ اس کے حامی نے رائے طلب لہجے میں ہولے سے کہا۔

”اڑے بابا تم لوگ ذرا ہمت تو کرو۔۔۔ اور میرا ساتھ دو پھر دیکھو! میں
 کس طرح خیرل سندھو سے اپنے سردار بکن کا بدلہ لیتا ہوں۔“ دھاڑیل جانو جگری
 نے مکاری سے کہا تو ایک دوسرا حمایتی بولا۔

”جانو سائیں! ہماری تو حیثیت گروہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہے سہی
 اسے سردار تسلیم کر چکے ہیں۔“

وقت آنے دو۔“ جانو جگری زہریلے لہجے میں سرسرایا۔
 ”تم فی الحال ایک کام کرو۔ آہستہ آہستہ گروہ کے دیگر لوگوں کے دلوں میں
 خیرل سندھو کے خلاف نفرت کا زہر بھرو۔ ایک بار میں گروہ کا سردار بن گیا تو میں اس
 حسین شہزادی سوئی کو اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ میرا دل بڑا ہے۔ پھر وہ گروہ کے ہر
 ساتھی کی روزانہ رانی بنے گی۔ میں تو مل بیٹھ کر کھانے والا ہوں بابا!“

جانو جگری نے شیطانیت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ باقی لوگوں
 کے دلوں میں سوئی جیسی حسین شہزادی کو ایک رات کی رانی کے تصور سے بجلیاں
 کوندنے لگیں۔ ادھر بے چاری سوئی اس زہرناک حقیقت سے بے خبر نازاں و شاداں
 اپنی چھوالداری میں بیٹھی تھی کہ جانو جگری جیسا ایک شیطان اس کے اور اس کے ہونے
 والے شوہر خیرل سندھو کے خلاف کسی مذموم سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف

ہے۔

☆.....☆.....☆

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ باہر سناٹا بھی چنچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا
 تھانے کی مختصر اور سالخورہ عمارت پر گہرا سکوت طاری تھا۔ گنی جینی چند سلاخ والی
 کوٹھریوں میں قیدی پڑے اونگھ رہے تھے۔ انہی میں بد نصیب اور حالات زدہ محمد پتل
 بھی موجود تھا۔ مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ جیل کی تنگ و تاریک سیلن زدہ کوٹھری
 میں اکھڑے ہوئے ننگی اینٹوں والے فرش پر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا اپنی تقدیر کو رو
 رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار دادن کا چہرہ ابھر رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر
 غصے سے کھول رہا تھا۔ اسے ساتھ ہی تھانیدار حکم داد پر بھی طیش آرہا تھا جس نے سرمد
 کے قتل کے جھوٹے الزام میں اسے داخل زنداں کر دیا تھا۔ پتل کو دادن اور منشی میرو
 کی سازش کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ دادن نے منشی میرو اور رئیس
 جابر خان کے ساتھ ملی بھگت کر کے اسے پہلے تھانے پھنسا کر اپنا راستہ صاف کرنے کی
 کوشش کی تھی اور اب وہ رئیس ہی کی مدد سے اس کے بوڑھے ماں باپ پر دباؤ ڈال کر
 اس کی معصوم بہن سوئی کا سنگ (رشتہ) حاصل کرنا چاہتا تھا۔ محمد پتل کا دماغ ان
 ٹولیدہ حالات تلے بری طرح جلنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لاک اپ کی
 آہنی سلاخوں کو توڑ کر سیدھا دادن کے پاس پہنچے اور اس کا زرخرہ چپا ڈالے۔

”چلو باہر آؤ۔“ اس میں سے ایک نے سلاخ دار دروازہ کھول کر کرخت
 لہجے میں اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ پتل حیران و پریشان تھا کہ اسے اس وقت کہاں
 لے جایا جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو تو وہ اس خیال سے لرز اٹھا کہ کہیں اسے دانستہ فرار کا
 موقع دے کر پولیس مقابلے کی صورت میں قتل تو نہیں کیا جائے والا تھا۔ بہر طور پر وہ
 گرداب خیالات کو جھٹکتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں سپاہی اسے خاموشی کے
 ساتھ حوالدار حکم داد کے کمرے میں لے آئے۔

”ہرگز نہیں! یہ جھوٹا بیان ہے؟“ پتل اپنی بات پر اڑ گیا۔

حوالدار حکم داد نے سنسناتی ہوئی نظروں سے اسے گھورا پھر ہونٹ چبا کر بولا۔

”دیکھو نعل! تو اپنا جرم مانے کا تو تیری سزا کم ہو جائے گی اور تو مار سے بھی بچ جائے گا۔ اس لیے چمڑی ادھڑنے سے پہلے میری بات مان لے۔“ نعل اسکی مکاری سمجھ گیا تھا لہذا بدستور ٹیلے لہجے میں بولا۔

”مگر میں نے سرمد کا قتل کیا ہی نہیں ہے پھر کیوں میں اس جھوٹے بیان پر اپنا انگوٹھا لگاؤں؟“ اس کے حتمی انداز میں انکار پر حوالدار حکم داد نے قلم اپنی جیب میں رکھا۔ کاغذ لپیٹ کر اپنی قمیض کی جیب میں رکھا، اس کے بعد وہاں کھڑے دو سپاہیوں میں سے ایک کو حکمانہ کہا۔

”اڑے جا بشیر! ذرا بارہ نمبر کا لٹر اور کڑوے تیل کی بوتل لے کر آ۔۔۔ جا بابا جاکٹرا۔۔۔ شاباش۔“ بشیر نامی سپاہی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مودبانہ انداز میں سیلوٹ مارتا ہوا نکل گیا۔ چنل کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب یہ خبیث اپنی مرضی کے بیان پر انگوٹھا نہ لگانے کی اسے انسانیت سوز سزا سے دوچار کرنے والا تھا۔ دفعتاً تھانے کی عمارت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ یہ لوگ بری طرح چونک پڑے۔ حوالدار حکم داد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں چار پانچ ڈھاپا پوش دھاڑیل داخل ہوئے ان میں دھاڑیل خیرل سندھو بھی تھا۔ اس نے ایک محنتی سے سپاہی کی گردن دیوچ رکھی تھی اسے حوالدار حکم داد کے قدموں میں پٹچا اور سب نے حوالدار حکم داد پر اپنی کلاشکوفیں تھام لیں۔ خیرل سندھو غرا کر حوالدار سے بولا۔

”کوئی غلط حرکت نہیں چلے گی ہمارے ساتھیوں نے پورے تھانے کو گھیر رکھا ہے۔ محمد پتل کہاں ہے؟“

کمرے میں بلب روشن تھا۔ سامنے میز کرسی پر حوالدار حکم داد اپنی دونوں ٹانگیں میز پر پارے بیٹھا اس کی طرف سنسناتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ محمد پتل کو اپنے وجود میں پھریری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد حکم داد بہ دستور اسے گھورتا ہوا کرسی سے اٹھا اور پتل کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ پتل صرف پانچ جماعت پڑھا ہوا تھا مگر کاغذ پر اس تحریر کو پڑھ سکتا تھا۔ حوالدار حکم داد نے وہ کاغذ اس کی طرف بڑھایا اور کرخت لہجے میں بولا۔

”تو انگوٹھا لگاتا ہے یا دستخط کرتا ہے؟“

”مجھے نام لکھنا آتا ہے اپنا۔“ محمد پتل نے سپاٹ لمبے میں جواب دیا۔

”چل پھر اس پر اپنا نام لکھ کر انگوٹھا بھی لگا دے۔“ حوالدار حکم داد نے جیب سے قلم بھی نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ پتل الجھتی ہوئی نظروں سے کاغذ کو دیکھتے ہوئے اسے لے کر پڑھنے لگا تو اس کی کنپیٹیوں پر سائیں سائیں ہونے لگیں۔ وہ اس کی طرف سے لکھا ہوا خود ساختہ بیان تھا جس کی رو سے محمد پتل نے واقعی اپنے چچا زاد سرد کا خون اس لیے کیا تھا کہ اس نے اس کی بہن سوہنی سے ملگنی توڑ دی تھی۔

”میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔ یہ جھوٹا بیان ہے۔ میں نے سرمد کا قتل نہیں کیا۔۔۔۔۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ حوالدار حکم داد کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور ایک چٹاخ کی بلند آواز کمرے میں گونجی۔ پتل اس کا بھاری بھر کم تھپڑ کھا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ اس کا بایاں گال سرخ ہو گیا تھا۔ پتل نے مارے طیش کے دانت بھیج لیے۔ حوالدار حکم داد جلا دھفت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔

”اڑے اوچھوکرا!۔۔۔ شرافت سے اس کاغذ پر انگوٹھا لگا دے اپنا ورنہ!۔۔۔ لتر مار مار کر کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔“ اس کے غراتے ہوئے لہجے میں سفاک تہدید تھی۔

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ مجھے سوچی سمجھی سازش کے تحت ہی اس جھوٹے کیس میں پھنساویا گیا تھا تا کہ اس خبیث کتے دادن کا راستہ صاف ہو جائے اور وہ رئیس کے ذریعے میرے ماں پو (باپ) پر دباؤ ڈال سکے۔“

پھر اس نے دھاڑیل خیرل سندھو کا شکریہ ادا کیا اور پھر اسے بھی حوالدار حکم داد کے بارے میں بتایا کہ کس طرح اس سے ایک خود ساختہ بیان والے لکھے گئے کاغذ پر زبردستی اس کا انگوٹھا لگوانا چاہتا تھا۔ سوئی اور دھاڑیل خیرل سندھو بھی اس کی مختصر اکتھاسن کردم بہ خود رہ گئے تھے پھر دھاڑیل خیرل سندھو غراہٹ آمیز انداز میں بڑبڑایا۔

”حوالدار حکم داد۔۔۔۔۔ لگتا ہے رئیس کا رتب خوار بن چکا ہے۔ خیر! اب تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ حکم داد سمجھ گیا، لگا کہ تو کس کا آدمی ہے؟“

اس وقت ہلکے ہلکے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ تینوں وہیں چھوالداری میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ سارا دن دونوں بہن بھائی جنگل ڈیرے پر ہی موجود رہے پتل اپنے گھر جانا چاہتا تھا مگر دوبارہ گرفتاری کے خوف سے اس کی ہمت نہ کر سکا البتہ اس نے اپنی بہن سوئی کو سمجھایا کہ کم از کم وہ تو گھر چلی جائے لیکن سوئی نے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر گھر گئی تو دادن سے اس کی زبردستی شادی کر دی جائے گی۔ پتل اس کی بات پر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے بھی مشورہ دیا کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے انہیں انہی کے پاس رہنا چاہیے۔ چنانچہ پتل نے کچھ روز ادھر ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مردم گزیدہ دھاڑیل خیرل سندھو کا شکر گزار تھا۔

یہ اس دن بعد دوپہر کا ذکر تھا۔ ایک مخبر اللہ بچایو نے آ کر ایک چونکا دینے والی اطلاع دی۔ اس نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ پولیس پتل کے سارے خاندان کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہے۔ اس کی بیوی ریشماں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ پتل نے

محمد پتل نے اپنا نام ایک اجنبی سے سنا اور چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
حوالدار حکم داد بری طرح سے پریشان اور متوحش نظر آ رہا تھا۔ اس نے بالآخر قریب کھڑے پتل کی طرف اشارہ کیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے پتل کے کاندھے پر ہاتھ دھر اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

”آؤ سنگت! تیری بہن سوئی تیرا انتظار کر رہی ہے۔“

محمد پتل بری طرح چونکا۔ خیرل سندھو اسے لے کر باہر آ گیا۔ ہر طرف دھاڑیل پھیلے ہوئے تھے جنہوں نے پولیس والوں کو نہتا کر رکھا تھا اور اپنی گن پوائنٹ پر آن لیا تھا۔ آن واحد میں یہ لوگ پتل کو لے کر اپنے گھوڑوں پر بیٹھے۔۔۔۔۔ اور رنو چکر ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

جنگل ڈیرے پر سناٹا طاری تھا۔ سوئی، دھاڑیل خیرل سندھو کے انتظار میں اس کی چھوالداری میں موجود تھی اور دعائیں مانگ رہی تھی کہ اس کا بھائی محمد پتل خیریت کے ساتھ جلد لوٹ آئے۔ خاصی دیر بعد جب مشرقی افق پر سپیدہ نمودار ہوا تو اسے باہر اچانک شور سنا دیا۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور وہ بے تابانہ انداز میں اٹھ کر چھوالداری سے باہر نکل آئی تو سامنے نیم اجالے میں اس نے دیکھا کہ خیرل سندھو کے ساتھ اس کا بھائی محمد پتل بھی اس کے گھوڑے سے نیچے اتر رہا تھا سوئی اپنے بھائی کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ وہ بے اختیار ازراہ مسرت ”اداہتل“ کہتی ہوئی اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ پتل بے چارہ اپنی معصوم بہن کو ان خطرناک دھاڑیلوں (ڈاکوؤں) کے درمیان دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے دونوں کو چھوالداری میں آنے کا کہا پھر اندر آ کر دھاڑیل خیرل سندھو نے محمد پتل کو اس کی بہن سوئی سے متعلق ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ محمد پتل یہ سن کر سناٹے میں آ گیا پھر دانت بھینچ کر غصے سے بڑبڑایا۔

یہ سنا تو مارے طیش کے لرز اٹھا۔

”میں اس خبیث انسپکٹر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”اڑے بابا سنگت (دوست) حوالدار حکم داد کو رئیس کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان لوگوں کو ہم سب مل کر اچھی طرح مزہ چکھائیں گئے۔“ دھاڑیل خیرل سندھو نے زہر خند لہجے میں کہا تو محمد پنل کی مخدوش خیال کے تحت بولا۔

”بھانیرل! وہ کتا حوالدار میرے ماں پیو کو پریشان کر سکتا ہے۔“

”اس کی اب ہمت نہیں پڑے گی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ خیرل سندھو معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

اس کا خیال اپنی جگہ درست تھا مگر اگلے دن ہی ان تینوں کو ایک الگ ہی واقع کی اطلاع ملی۔ دھاڑیل خیرل سندھو کے ایک مخبر ساتھی نے یہ لرزہ خیز اطلاع دی کہ رئیس نے پنل کے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کو نجی جیل میں قید کر دیا ہے۔

اس اطلاع پر تینوں سناٹے میں آ گئے۔ پنل کے اندر آتش فشاں کھولنے لگا سوئی بری طرح دہل گئی۔ دھاڑیل خیرل سندھو کے چہرے پر ازلی درشتی کھنڈ آئی۔

”میں اس بد بخت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ پنل نے غلیظ آلود لہجے میں کپکپاتے ہوئے کہا تو دھاڑیل خیرل سندھو نے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

”سنگت! ہم تیرے ساتھ ہیں۔ آج رات رئیس سے بھی نمٹ لیتے ہیں۔“

یہ خبر اس کے مار آستین اور سازشی ساتھی دھاڑیل جانو جگری سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ اسے جیسے ہی یہ پتا چلا کہ سردار دھاڑیل خیرل سندھو اور پنل اپنے ساتھیوں سمیت رئیس کی حویلی میں شب خون مارنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے تو فوراً اسے گل کھلانے کا موقع مل گیا۔ اس نے اسی وقت درپردہ پولیس مخبر ساتھی کے ساتھ رئیس کی کارپردازی نبھاتے ہوئے اپنے ایک قابل اعتماد مخبر ساتھی کے ذریعے

پہلے متعلقہ تھانے کے حوالدار حکم داد کو یہ خفیہ اطلاع پہنچائی جو اس نے فوراً رئیس کے بھی گوش گزار کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ حوالدار حکم داد پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ ہی رئیس کے مسلح آدمی بھی چوکنٹا ہو گئے۔

ادھر دھاڑیل خیرل سندھو اور محمد پنل اس سازش سے غافل تھے۔ جیسے ہی رات سر پر پہنچی اور چہار سواندھیاروں کا راج ہوا تو دھاڑیل خیرل سندھو نے اپنے الگ تھلگ سولہ مسلح دھاڑیل ساتھیوں کی کھیپ تیار کی۔ اس نے پنل کو اپنے ساتھ جانے سے روکنا چاہا مگر جب وہ نہ مانا تو اس نے مجبوراً اسے بھی ایک عدد رائل تھامی پھریہ لوگ سب سب گرفتار گھوڑوں پر جنگل ڈیرے سے روانہ ہو گئے۔ مار آستین جانو جگری ان کے روانہ ہوتے ہی مکاری سے مسکرانے لگا۔ اگرچہ دھاڑیل خیرل سندھو نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا مگر بڑی عیاری سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر جنگل ڈیرے پر ہی رک گیا تھا۔ اس کے ہم خیال ساتھی بھی جنگل ڈیرے پر ہی اپنے دوسرے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ وہیں موجود رہے تھے۔

سازشی جانو جگری اب تصور میں پنل اور سردار خیرل سندھو کو سلاخوں کے پیچھے یا خون آلود لاشوں کی صورت دیکھ کر دل ہی دل میں بڑا خوش ہو رہا تھا اور ساتھ ہی سوئی کو بھی اپنی رانی بنانے کے خوش کن تصور میں خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اس کی شیطانی نظریں سوئی پر کب سے تھیں۔ آج اسے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خوب موقع ملا تھا۔

ادھر بے چاری الم نصیب سوئی کو کیا علم تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ دھاڑیلوں کے اس خطرناک گروہ کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اگرچہ چند روز ہی ہوئے مگر اسے رائل اٹھانی آگئی تھی۔ وہ اسے چلا بھی لیتی تھی مگر نشانہ ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا۔ اپنی حفاظت کیلئے اس وقت بھی دھاڑیل خیرل سندھو نے اسے حفظ ماتقدم کے تحت ایک عدد رائل تھامی دے رکھی تھی۔ وہ اپنی چھوٹا لداری میں تنہا موجود تھی۔

ادھر دھاڑیل جانو جگری نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک بار پھر اپنے ہم خیال ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور اس وقت جنگل ڈیرے میں موجود دھاڑیل خیرل سندھو کے آدمیوں کی تعداد سے متعلق پوچھا۔

ہا کو نامی اس کے ایک ہم خیال ساتھی نے اسے سرگوشی میں بتایا۔

”جانو سائیں! موقع اچھا ہے۔ اس وقت جنگل ڈیرے میں ہمارے حمایتی ساتھیوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ چند گنے چنے سردار کے حامی یہاں ہوں گے باقی تو سمجھو سردار خیرل کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔“

فتح کے جوش سے جانو جگری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر سفاکانہ لہجے میں ہونٹ سیڑ کر بولا۔

”چلو پھر اس وقت ان چند دشمنوں کو بھی خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دو۔ میں ذرا اس حور پری سوئی کے ساتھ رنگ لیاں مناتا ہوں جا کر۔“

یہ کہہ کر اس کے ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ظلم و بربریت کا کھیل شروع ہو گیا۔ سوئی شیطان خصلت جانو جگری کی صورت اپنی طرف بڑھتی ہوئی مصیبت سے بے خبر اپنی چھو الداری میں موجود تھی۔ اچانک وہ چونکی۔ سامنے دھاڑیل جانو جگری کھڑا اسے شیطانیت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔ سوئی کی چھٹی جس نے ایک ایسی اسے خطرے کا احساس دلایا۔

☆.....☆.....☆

دھاڑیل خیرل سندھو اور پتل کے گھوڑے ساتھ ساتھ تھے۔ باقی ساتھی عقب میں چلے آ رہے تھے۔ جنگل ڈیرے کی حدود سے نکلتے ہی یہ لوگ جب رئیس کے گوتھ کی حدود میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار کم کر دی۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے پندرہ رکنی گروہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک کی کمان خود سنبھال لی جب کہ دوسرے کی کمان اپنے ایک مقرب خاص دھاڑی ساقی منٹھار علی

کے سپرد کر دی اور اسے رئیس کی حویلی کے عقب میں پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے کل آٹھ ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا تو باقی اپنے سات ساتھیوں کے ساتھ وہ آگے بڑھا۔

کیکر اور سرس کے درختوں کا یہ گھنا جنگل پار کر آئے تھے اور اب تاریکی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کے کنارے واقع قد آدم خورد و جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ

آگے بڑھنے لگے۔ آسمان پر تارے ٹٹمار رہے تھے اور پوری تاریکیوں کا طباق چاند بھی روشن تھا مگر آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں میں وہ گاہے بگاہے اپنی روشن چھب دکھا کر پھر ان کے پیچھے ہو رہا تھا۔ دور کہیں آوارہ کتوں اور السائے ہوئے گیدڑوں کے چلانے کی

مدھم سی آوازیں چار اطراف چھائے گہرے دم بہ خود سنائے میں لرز رہی تھیں۔ ادھر یہ لوگ اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ یہ جن کی موت بن کر اپنے جس شکار کے پیچھے

جار ہے تھے وہ خود ان کی موت کی صورت گھات لگائے دانت نکوسے بیٹھے تھے چنانچہ اسی سے شکار شکاری بننے والا تھا اور شکاری شکار۔

اچانک رات کے چپختے ہوئے سنائے میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ خیرل سندھو اور پتل کے عقب میں آتے ہوئے ساتھیوں میں سے چار دل

خراش چیخوں کے ساتھ گھوڑوں سے نیچے آ رہے گولیوں کی ایک باڑ نے دھاڑیل خیرل سندھو کا دایاں کاندھا چھید ڈالا اور پتل کو اپنے بائیں بازو میں گولی سلاخ کی

مانند گھستی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں بھی نیچے آ رہے۔ مگر پھر زخمی ہونے کے باوجود تیزی سے قریب کے جھاڑی دار جھنڈ میں رینگ گئے اور فائرنگ کی سمت انہوں نے بھی اپنی

گنوں کے دہانے کھول دیے۔ ذرا دیر قبل خاموش طوفان کی آمد دیتے ہوئے سنائے میں ایک کی جیسے پُر شور حشر بپا ہو گیا تھا۔ خیرل سندھو کا دایاں کاندھا بری طرح گھائل

تھا۔ شکر تھا کہ ہڈی سلامت رہی تھی۔ چند گولیاں اگرچہ گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھیں مگر اکا دکا ابھی تک گوشت میں پیوست تھیں۔ خیرل سندھو اس تکلیف کو خاطر میں

لانے والا کہاں تھا۔ جم کر جوابی فائرنگ میں مصروف تھا البتہ پتل پہلی بار ایسے حالات

سے گزرا تھا مگر اس نے اپنے حواس قابو میں کر رکھے تھے اور برابر مقابلے میں مصروف تھا۔ ادھر باقی ساتھی بھی نامعلوم حملہ آوروں پر گولیاں برس رہے تھے خیرل کو فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ ضرور اپنے ہی گروہ کی کسی کالی بیٹھڑ نے مخبری کر ڈالی ہے، لیکن اس سے موجودہ حالات کی سنگینی سے نمٹنا پہلے ضروری تھا۔ ان پر حملہ سب سے پہلے دور کھیتوں میں چھپے رئیس کے مسلح آدمیوں نے کیا تھا۔ ان کی تعداد دس بارہ کے قریب تھی اور ان میں پولیس کی نصف تعداد بھی شامل تھی جب کہ باقی نصف نے حویلی کو اپنے حفاظتی حصار میں لے رکھا تھا۔

دھاڑیل خیرل سندھو نے آنا فانا پانچ دشمنوں کو مار گرایا۔ اس کے تین ساتھی بھی جم کر مقابلہ کر رہے تھے۔ فضا میں بارود کی ناگوار بو پھیلنے لگی تھی پھر معافی انہیں جنوبی سمت سے بھی فائرنگ سنائی دینے لگی۔ یہ وہ علاقہ تھا جدھر خیرل سندھو نے اپنے آٹھ ساتھیوں کے دوسرے ٹولے کو منٹھار علی کی کمانڈ میں روانہ کیا تھا۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی طرح ان پر بھی ایسا ہی اچانک حملہ ہوا تھا۔ گولیوں کی گھن گرج سے پورا ماحول گونج رہا تھا۔ پتل بھی باقاعدہ نشانے لے کر دشمن گرانے میں محو تھا۔ پھر پتل خیرل سے ذرا جدا ہو گیا۔ اچانک اس کی نظرتاروں کی مدھم روشنی میں اس خبیث حوالدار حکم داد پر پڑی۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ جوش اور جلد بازی کے باعث وہ اپنی حفاظتی احتیاط بھی بھلا بیٹھا اور یک دم جھاڑیوں سے ابھر کر حوالدار کا نشانہ باندھنے لگا۔ ادھر اچانک خیرل سندھو بھی لڑتے لڑتے اس کے قریب آ گیا تھا۔ ادھر پتل نے جیسے ہی حوالدار حکم داد کا نشانہ لینا چاہا اچانک ایک دشمن کی گن نے پورا برست اُگلا۔ خیرل سندھو کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے غصے سے دانت پیسے، پتل کے قاتل دشمن پر برست فائر کر دیا۔ وہ بھی خون کی چھپڑی میں ڈوب گیا۔ پھر وہ زمین پر گرے ہوئے بے سدھ پتل کی طرف لپکا، مگر وہ مر چکا تھا۔ خیرل سندھو کو اس کی موت کا بہت دکھ ہوا اور وہ پتل کی لاش کو متاسفانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دل گیر لہجے میں

بڑبڑایا۔

”میں نے تجھے کہا بھی تھا نہ جا! یہ تیرے بس کا کھیل نہیں“ پھر وہ جھاڑیوں میں چھپتا چھپتا آگے بڑھنے لگا۔ اس کے دیگر تین ساتھی بھی دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے ان کے ساتھ آن ملے تھے۔ منٹھار علی اور دیگر دھاڑیل ساتھی بے جگری سے رئیس کے آدمیوں اور پولیس سے مقابلہ کر رہے تھے۔ رئیس کے کافی آدمی مر چکے تھے باقی شاید میدان کارزار سے کھسکنے لگے تھے۔ اب پولیس کی کچھ تعداد موجود تھی۔ خیرل سندھو اب باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مقابلہ کر رہا تھا۔ اس نے حوالدار حکم داد کو بھی اس لڑائی میں شریک دیکھ لیا تھا۔ وہ اب اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ لہذا وہ جنگلی بلے کی طرح جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا حوالدار حکم داد کے بالکل سر پر جا پہنچا اور پھر یک دم اس نے جھاڑیوں سے ابھر کر اپنی کلاشکوف اس کی کپٹی سے لگا دی۔ حوالدار حکم داد اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اپنے کتوں سے کہو کہ فائرنگ روک کر ہتھیار پھینک دیں۔۔۔۔۔ ورنہ تیری کھوپڑی اڑا دوں گا میں۔“

حوالدار حکم داد کا ویسے ہی خون خشک ہو رہا تھا اس نے جلدی سے اپنا سروس ریوالور پھینکا پھر چلا کر اپنے سپاہیوں سے بھی فائرنگ روک کر ہتھیار پھینکنے کا لرزندہ حکم دیا۔ سپاہیوں نے اپنے افسر کو گن پوائنٹ پر دیکھا تو فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ فضا میں یک لخت سناٹا چھا گیا۔ پھر دھاڑیل خیرل سندھو نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی تو انہوں نے آگے بڑھ کر پولیس کے پھینکے ہوئے ہتھیاروں کو اٹھالیا۔ ان میں رئیس کے چند آدمی بھی ریغمال بنا لیے گئے۔ خیرل کے صرف نو ساتھی زندہ بچے تھے پھر یہ لوگ انہیں گن پوائنٹ پر دھکیلے ہوئے رئیس کی حویلی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

”حکم داد! اپنے سپاہیوں سے کہو کہ اندر حویلی جا کر رئیس سے کہیں کہ اگر وہ

غدار جانو جگری نے اس بار خون خوار لہجے میں اس سے کہا اور اس کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔ ساتھ ہی ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”اب اس پورے گروہ کا صرف میں سردار ہوں۔۔۔ جانو جگری!۔۔۔ ہا۔ ہا۔“ وہ طاقت کے نشے میں چور تھا۔ ایک موقع پر اچانک سوئی نے اس کے نازک مقام پر زور سے اپنا گھٹنا سید کر دیا۔ جانو جگری کو اس سے اتنی جرأت کی توقع نہ تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے تھوڑا کرہا تھا۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی سوئی تڑپ کر آزاد ہو گئی اور بڑھ کر پھرتی سے اپنی دیوار سے ٹکی ہوئی رائفل اٹھالی اور فوراً اسے جانو جگری پر تان لیا۔ ایک لمحے کو جانو جگری کے چہرے پر سناٹا چھا گیا مگر اس کی آنکھوں میں ابھی تک خون خواری اور سفاک چمک نہ ہوئی تھی۔

”چھو کر! یہ غلطی نہ کرنا۔۔۔ باہر سب میرے اپنے ساتھی موجود ہیں۔ وہ سب کے سب تجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔ پھینک دے اس کھلونے کو شاہاش! میں تیرا سہارا ہوں گا۔ تجھ سے شادی۔۔۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سوئی نے لیلیٰ بادی رائفل پہلے ہی سے برسٹنگ پوائنٹ پر ایڈجسٹ تھی۔

نتیجتاً رائفل نے گرج دار آواز کے ساتھ ایک پورا برسٹ اگلا تھا جس نے غدار جانو جگری کا سینہ چھلنی کر کے رکھ دیا۔ وہ کریمہ انگیز چیخ مار کر زمین بوس ہو گیا۔

مرتے وقت اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اسے شاید ایک سیدھی سادی دیہاتی ان پڑھ لڑکی سے ایسی مارا ماری کی توقع ہرگز نہ تھی۔ گولیوں کی آوازیں کر جانو جگری کے حمایتی اور خیرل سندھو کے ساتھی بھی اندر آ گئے۔ سوئی نے انہیں بتایا کہ یہ خبیث جانو جگری کس نیت سے اس کے پاس آیا تھا نیز اس نے ان کے سردار خیرل سندھو کے ساتھ کیسی سازش چلی تھی۔ جانو جگری کے حامیوں کا اس کی لاش دیکھ کر حوصلہ جاتا رہا تھا اس لئے وہ سردار خیرل کے بے جگر آدمیوں کے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے البتہ خیرل سندھو کے آدمی پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلے تو

غدار جانو جگری کی لاش پر حقارت سے تھوکا پھر سوئی کو تسلی دیتے ہوئے آپس میں صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ انہیں باہر شور سانسائی دیا۔ یہ لوگ چونک کر باہر نکلے۔ سوئی بھی باہر آ گئی اور دھک سے رہ گئی۔ سامنے خیرل سندھو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے سے نیچے اتر رہا تھا اور اس کے کاندھوں پر اس کے بھائی پتل کی لاش تھی۔

وہ ”ادا پتل!“ کہہ کر ہسٹریائی انداز میں چلا کر دوڑی اور بھائی کی خون آلود لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔

خیرل سندھو نے اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے چھوڑ دیا۔ ذرا دیر بعد اسے بتا دیا گیا کہ یہ ساری سازش اس غدار جانو جگری کی تھی۔ پھر خیرل سندھو نے سکیاں لیتی ہوئی سوئی کو سنبھالا اور اسے بتایا کہ اب اس کے گھر والوں کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ اگر وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے تو چلی جائے۔

سوئی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو خیرل سندھو کے دل کو گھونسا لگا۔ وہ اندریں دل سے یہی چاہتا تھا کہ سوئی نہ جائے مگر اس نے اپنے دل پر قابو پایا اور اپنے چند ساتھیوں کی حفاظت میں سوئی کو اس کے گوتھ روانہ کر دیا۔ پتل کی لاش بھی وہ لے گئے تھے۔

سوئی کے جاتے ہی دھاڑیل خیرل سندھو اس سا ہو گیا تھا۔ اسے سوئی سے ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی کیونکہ وہ اسے دل سے پسند کرنے لگا تھا وہ رنجور سا ہونے لگا۔

خاصی دیر بعد اس کے ساتھی واپس لوٹے تو وہ بری طرح ٹھٹھکا۔ سوئی اپنے بھائی کی تدفین کے بعد واپس آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک چوبیس پچیس سالہ کبر و جوان تھا۔ رنگت سانولی اور چہرے کے نقوش خالص دیہاتی طرز کے موٹے موٹے اور وجیہ تھے۔ اس نے اجلی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور پیروں میں کھڑیاں تھیں۔ سر پر شیشے کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی اور کاندھے پر اجرک ڈال رکھی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو یہ نوجوان، نوراً جیسی ملنے والی ایسی حسین دلہن پر خود اپنی قسمت پر رشک کر رہا ہوتا۔ لیکن اس سے تو جیسے کسی نظر نہ آنے والی منحوس آفت نے ان سب کی خوشیوں اور شادمانیوں کو ملیا میٹ کر ڈالا تھا کیوں کہ دولہا محمد وسان کے چہرے پر خوشی کی بجائے گہرے تفکر اور قدرے غیظ و جوش کے بھی آثار نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں موجود ان چاروں عمر رسیدہ مرد و عورتوں نے، جو بلاشبہ ان دونوں نو بہا ہتادلہن کے ماں باپ ہی تھے۔۔۔ نوجوان

وہ بڑا عجیب، رقت آمیز اور دل فگار منظر تھا۔ کچی دیواروں والے ایک بوسیدہ سے صحن میں۔۔۔۔۔ مضطرب الحال سے وہ کل چھ افراد موجود تھے۔ جن کے پڑمردہ چہروں پر اس وقت غم ناک پر چھائیاں طاری تھیں۔ رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ چاند کی دکتی روشنی میں گارے مٹی کی بوسیدہ دیواروں کے سائے بھی دم بہ خود سے پراسرار ہیولوں کی طرح اس رقت بھرے غمگسار منظر کو جیسے خامشی سے گھورتے محسوس ہو رہے تھے۔

دودھیاتی وضع قطع کی عمر رسیدہ عورتیں، جنہوں نے سروں پر اجرکوں کی میلی سی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ ایک نوجوان اور ایک خوب صورت لڑکی کو باری باری اپنی چھاتی سے لگا کر سسک رہی تھیں۔ لڑکی نے نیا نیلا مقامی طرز کا جھلملاتا سندھی

محمد وسان کی بڑی منت سماجت اور اپنے بڑھاپے کا واسطہ دے کر بالآخر کسی ایسے اقدام پر مجبور کر ڈالا تھا۔۔۔ جس پر وہ قطعی راضی نہ ہو۔ روتی، سسکتی دلہن کو بار بار اپنے سینے سے لگانے والی ان دو عمر رسیدہ عورتوں میں ایک اس دلہن کی ماں مائی عجیاں تھی اور دوسری عورت اس کی ساس یعنی نوجوان کی ماں حیاتاں بی بی تھی۔۔۔ جو دلہن نوران کی چاچی بھی لگتی تھی۔۔۔ نوران کا بوڑھا سر مٹھل بھی وہاں موجود تھا اور اس کا باپ احمد بخش بھی۔ یہ دونوں بیک وقت آپس میں بھائی اور اب سدھی بن چکے ہیں۔

غم اگر محض بیٹی کو رخصت کرنے ہی کا ہوتا تو اس وقت وہ سب لوگ اس قدر دل گرفتہ اور رنجور و مجبور نہ ہوتے۔ دکھ تو اس بات پر انہیں ہو۔ ہا تھا کہ جن کڑے حالات کی آندھی میں ان دونوں نو بیاہتا میاں بیوی کو اس ننگسار رات کے درمیانی پہر مکمل راز داری کے ساتھ گھر سے ہی نہیں بلکہ گوٹھ سے بھی باقاعدہ ہجرت کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ ان سارے افراد کیلئے کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھا۔

رات کے پہر اس پر اسرار ہجرت آمیز رخصتی کے پس پردہ درحقیقت ایک خونچکاں داستان مضمون تھی۔ ہجرت کے اس عمل پر جہاں دکھ اور غم ہجراں کی کسک تھی اس سے کہیں زیادہ ان سب کے دلوں میں ایک انجانا خوف اور اندیشوں کے ناگ بھی پھن کاڑھے ہوئے موجود تھے۔

بہر طور جب رونے دھونے اور آنسو بہا کر بار بار گلے ملنے کا یہ رقت آمیز عمل طول پکڑنے لگا تو بالآخر نوجوان دو لہجہ محمد وسان کے باپ مٹھل نے اپنی بیوی حیاتاں سمیت سدھن کو بھی تنبیہ آمیز سرگوشی میں کہا۔

”ارے بابا! اب یہ رونا دھونا چھوڑو دیر نہ کرو جلدی سے اب ان دونوں کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرو۔ تڑکے سے پہلے پہلے یہ دونوں یہاں سے جتنی دور نکل جائیں اتنا ہی چنگا (بہتر) رہے گا۔“

اس کی بات پر لڑکی کی ماں مائی عجیاں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ہلتی

لہجے میں سدھی مٹھل سے کہا۔

”ادا اتنا کھور نہ بن۔ میکوں اپڑیں دھی راڑیں سے چنگی طرح مل تو لینے دے۔ پتا نہیں پھر کب۔۔۔؟“ فرط رقت و غم سے عجیاں کی آواز رندھ کر حلق میں ہی بھنچ سی گئی تو مٹھل قدرے تیز مگر دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

”ادی! بیٹے اور بیٹی کا تو یہ دکھ اب ہم سب کو ہی مل کر بھگتنا پڑے گا۔ اسی میں ان دونوں بچوں کی بہتری ہے۔ یہ تسلی تو دل کو رہے گی ناں کہ یہ دونوں زندہ تو ہوں گے۔ میرا اپڑاں پٹ بھی تو ہے وسان تو میری ساری حیاتی کی کمائی ہے ادی! میرا بھی تو جگر ہے نا بابا۔۔۔ اپڑیں حیاتی سے دور کر رہا ہوں اسے۔“

بوڑھے مٹھل کے لہجے میں درد و الم کی گہری کاٹ تھی۔ اس نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے اٹھ پڑنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی خاطر اپنا سر جھکا دیا تھا۔ ایسے میں احمد بخش اپنی بیوی عجیاں کو ٹوکے ہوئے ذرا نیچی آواز میں بولا۔

”چل اب چپ کر بھائی مٹھل صحیح بولتا ہے۔ حیاتی رہی تو دوبارہ ہم اپڑیں بچوں سے مل لیں گے۔“ خود احمد بخش کی آواز یہ کہتے کہتے بوجھل سی ہو رہی تھی۔ وہ پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ دبلا پتلا اور سانولی رنگت کا مالک۔ اپنے بڑے بھائی اور سدھی مٹھل سے دو سال ہی چھوٹا تھا۔ دونوں بوڑھے بھائی وڈیرے دریا خان کی زمینوں پر دھاک (مزدوری) کرتے تھے۔ قدرے توقف کے بعد احمد بخش اپنے بھائی مٹھل سے مخاطب ہو کر بولا۔

”بھا۔۔۔! باہر نیل گاڑی تو تیار ہے ناں۔۔۔؟“

”ہاؤ ادا بخش۔۔۔! بس ان دونوں بالکوں (بچوں) کے نکلنے کی دیر

ہے۔“

مٹھل کے لہجے سے اب جلد از جلد ان دونوں دولہا دلہن کو رخصت کرنے کی

عجلت آمیز پریشانی ہونے لگی تھی۔

”ہاؤ بابا۔۔۔ چلو اب۔۔۔ تم دونوں۔۔۔ اندر جاؤ۔۔۔ تمہارے رونے کی آواز سے دیواروں کے بھی کان کھڑے نہ ہو جائیں۔“ اس نے آخر میں عجیبیاں اور حیاتاں کو اندر کوٹھری نما ایک کمرے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ دونوں بے چاریاں ستم رسیدہ مائیں اب کے آخری بار دلہن نوراں اور دولہا محمد دسان سے گلے مل کر اور انہیں مجبور نگاہوں سے دیکھتی اور اپنے آنسو پونچھتیں وہاں سے چلی گئیں۔

دروازے کے باہر۔۔۔ نیل گاڑی موجود تھی۔ جس پر ترپال اور رلی کی گودڑی سی بچھا دی گئی تھی۔۔۔ نیل گاڑی کے جوئے میں جتے ہوئے دو توانا نیل۔۔۔ اس وقت اپنی لسائی ہوئی موٹی موٹی ابھرواں آنکھوں میں عجیب سی معصومیت سمونے خاموشی سے کھڑے تھے۔

ایک ٹین کا صندوق تھا اور دیگر چھوٹا موٹا سامان نیل گاڑی پر لاد جانے لگا پھر دلہن نوراں کو بھی۔۔۔ آہستگی سے نیل گاڑی پر سوار کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا شوہر محمد دسان بھی بیلوں کے پشتوں والے گاڑی کے تختے پر لگا میں تھا مے براجمان ہو گیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے بیلوں کو مخصوص آواز میں ٹسکارتے ہوئے انہیں آگے بڑھا دیا۔ نیل گاڑی کے چوبی پیسے رات کی اس غمگسار تاریکی میں ہولے سے چرچرائے اور پھر یہ آگے بڑھ گئے۔۔۔ سامنے گلی میں دور تک ویرانی اور تاریکی تھی۔ چہار سو غضب کا سناٹا طاری تھا۔ گھر کے دروازے پر موجود دولہا دلہن کے بد نصیب ماں باپ غم ناک آنکھوں سے نیل گاڑی کو جاتا دیکھ رہے تھے۔ پھر جب نیل گاڑی کے نچلے تختے کی چوبی ناب سے بندھی جھولتی ہوئی لائٹن کی جوت کو بھی تاریکی نے نگل لیا تو یہ سب دل تھا مے۔۔۔ اندر چلے گئے۔

باہر تاریک رات، بھاری بسل کی طرح سرک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

نیل گاڑی اب کچے پکے بے ترتیب گھروں کی اندھیری گلیوں سے نکل کر۔۔۔ ایک بل کھاتی پگڈنڈی پر آگئی تھی۔ دائیں بائیں دور تک تاریکی میں ڈوبے ہوئے کھیت پھیلے ہوئے تھے آسمان پر آنکھ چھولی کرتے تاروں کی غمگسار روشنی میں۔۔۔ محمد دسان۔۔۔ نیل گاڑی کو اب باقاعدہ تیز دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ عقب میں دور گھروں کی بے ترتیب قطاروں کو تاریکی نے نگل لیا تھا۔ سامنے بل کھاتی ناہموار پگڈنڈیاں دور تک سنان تھیں۔۔۔ ذرا آگے۔۔۔ آوارہ کتوں کے غول نے آلیا۔

انہوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ مگر دسان لاتعلق سابیلوں کی رسی تھا مے انہیں آگے کو ہنکانے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر گہری تفکر آمیز بنیدگی کے ساتھ ایک جوش کی تہمت ہٹ بھی مترشح تھی۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں اس وقت ماضی کے جلنے مناظر گھوم رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر اس قدر پریشان کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسے اس بات کا بھی دھیان نہ رہا تھا کہ۔۔۔ اس کے عقب میں ترپال پر۔۔۔ اس کی نوبیا پتا دلہن۔۔۔ نوراں بھی سکڑی سٹی بیٹھی ہوئے ہولے سک رہی تھی۔۔۔ جو غالباً منتظر تھی کہ۔۔۔ ایسے کڑے وقت میں اس کا شوہر دل جمعی کے دو بول ہی کم از کم بول لیتا۔ لیکن۔۔۔ محمد دسان۔۔۔ تو کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ۔۔۔ اس نے جو کچھ کیا۔۔۔ وہ غلط کیوں تھا؟ بلکہ درست ہوتے ہوئے بھی وہ غلط کیوں تھا؟ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے مجرم بنا دیا گیا تھا۔ جھوٹ کے آگے۔۔۔ مصلحت کے نام پر سچ کو کیوں بٹھایا جا رہا تھا۔۔۔ اس لیے کہ۔۔۔ وہ ایک غریب ہاری کا بیٹا تھا اور شاید یہ اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔۔۔ سنا تھا۔۔۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر یہاں تو سچ کے پاؤں کاٹے جا رہے تھے۔ دسان کو گوتھ بدر ہونے کا اتنا دکھ نہ تھا۔ دکھ تھا تو اسے اپنے بوڑھے ماں

انتہائی انصاف پسند اور خدا ترس انسان بھی تھا۔ مظلوموں کو پناہ دیتا تھا ان کی داد رسی کرنے کے معاملے میں وہ خاصا مشہور بھی تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی پورے ”تھر“ کے علاقے میں شہرت تھی۔

وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر میں پناہ لینے کا مشورہ کس حد تک درست تھا؟ ابھی یہ دونوں محصور نہیں جانتے تھے۔ انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ۔۔۔ پو پھٹنے سے پہلے پہلے۔۔۔ انہیں زمیندار دریا خان اور اس کے بھیڑیا صفت کارندوں کے علاقے سے دور۔۔۔ بہت دور نکل جانا ہے۔ سو وہ ایسا ہی کر رہے تھے۔ وسان بظاہر خاموشی سے بیلوں کو دوڑانے میں مجھوتا۔۔۔ مگر اندر اس کے طوفانی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اس کی بظاہر اندھیروں کو گھورتی لہورنگ آنکھوں میں بار بار۔۔۔ زمیندار دریا خان اور اس کے مقرب خاص۔۔۔ کار پرداز، گہرام کے مکروہ چہرے رقصاں تھے۔ یہ دونوں وہ چہرے تھے جن سے۔۔۔ محمد وسان کو شدید نفرت تھی۔ انہی دونوں کی وجہ سے اسے آج یہ دن دیکھنے پڑ رہے تھے کہ وہ۔۔۔ ناچاہتے ہوئے بھی گوٹھ بدر ہونے پر مجبور ہوا تھا یوں تو اس نے ان دونوں شیطانوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی تھی مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ہاتھ جوڑنے اور رورو کرنتیں سمجھنے کرنے سے مجبور ہو گیا تھا۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ۔۔۔ اگر ان کے کڑیل اور جو شیلے بیٹے محمد وسان سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہوگئی تو وڈیرا اور اس کے خونخوار حواری نہ صرف ان کے جوان اکلوتے بیٹے کو مار ڈالیں گے بلکہ ان کے گھروں کو بھی جلا کر بھسم کر دیں گے۔ مولو ہاری، خیر بخش ہاری اور ہاری خدا بخش کا حشر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جنہوں نے زمیندار دریا خان اور اس کے حواریوں سے ٹکر لینے کی کوششیں کی تھیں اور ان کا پھر بھی کیا عبرت ناک حشر ہوا تھا کہ پورا گوٹھ اس انسانیت سوز بربریت پر لرز اٹھا تھا۔ اس لئے مٹھل ہاری اور احمد بخش ہاری نے وسان اور نور اس کو راتوں رات رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے ان دونوں کو زمیندار دریا خان

باپ اور چاچا جی کا۔۔۔ جو اس کے اب سسرالی بھی بن چکے تھے انہیں اکیلا چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ پتا نہیں کل کا سورج ان ہجر کے مارے غریب بوڑھوں پر کیسی کیسی آفتیں لانے والا تھا۔ اس کا تکلیف دہ احساس۔۔۔ وسان کا جگر پاش پاش کیے دے رہا تھا۔ وہ دل مسوں کر سوچنے لگا کہ بعض مرتبہ انسان اپنوں کی منت سماجتوں کے آگے کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ کہ اسے ان کا کڑے سے کڑا فیصلہ۔۔۔ ناچاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا کیا پھر۔۔۔ جب اس کے بوڑھے ماں باپ اور چاچا جی نے اپنی ٹوپیاں اور سر کی چادریں اس کے قدموں پر ڈال کر اسے راتوں رات اپنی دلہن کو لے کر گوٹھ سے نکل جانے کا اصرار کیا تو مجبوراً محمد وسان کو اپنوں کے اس تلخ فیصلے کا گھونٹ بھرنا پڑا تھا۔

نیل گاڑی کے پیچھے بھونکتے ہوئے آوارہ کتوں کا غول اب۔۔۔ غائب ہو چکا تھا۔ تاروں بھری رات۔۔۔ کسی الہز دلہن کی تیج کی طرح جی ہوئی تھی۔ اب تو ان کے عقب میں آبادی کے ساتھ۔۔۔ ساتھ۔۔۔ کھیت کھلیاں بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے اور دور سے ہیولوں کی طرح انہیں خدا حافظ کہتے محسوس ہو رہے تھے۔ آس پاس۔۔۔ مدہم روشنی میں پھیلا ہوا۔۔۔ بھر بھری مٹی اور کہیں کہیں چھدری چھدری اور خود رو جھاڑیوں کا میدان شروع ہو چکا تھا۔ کچھ کیکر کے درختوں کے اونگھتے ہوئے سے جھکے جھکے ہیولے بھی نظر آنے لگے تھے۔ فضا میں اب خنک ہوا سی محسوس ہونے لگی۔ وسان نے فوراً اندازہ لگایا کہ۔۔۔ وہ دریائے سندھ سے زیادہ دور نہیں اس نے بیلوں کی پشت پر پتلی ٹہنی والا چابک رسید کر دیا۔ مقصد بیلوں کو تیز دوڑانا تھا۔ کیوں کہ اسے سختی سے اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ وہ جتنی جلد ہو سکے دریائے سندھ کا یہ چوڑا پاٹ عبور کر کے دوسرے کنارے اتر جائے۔ ایک بار وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر میں داخل ہونے کے بعد وہ اور اس کی نو بیاہتا دلہن بالکل محفوظ ہو جائیں گے۔۔۔ کیوں کہ وڈیرا حاجی پیارو خان نہ صرف اپنے علاقے کا سردار تھا بلکہ وہ ایک

کے علاقے سے نکال دیا تھا۔

رات کا نصف پہر بیت چکا تھا۔ نیل گاڑی اب ایک ایسے میدان سے گزر رہی تھی جہاں جا بجا کھجی کے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے باپ مٹھل اور سراجھ بخش نے اسے تاکید کی تھی کہ۔۔۔ وڈیرے حاجی پیارو خان۔۔۔ کے پاس جا کر اسے ساری حقیقت سے بلا کم و کاست آگاہ کر دے اور ساتھ ہی مدد کی فریاد کرے۔۔۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ۔۔۔ وسان نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

وہ کڑھے ہوئے دل کے ساتھ سوچتا کہ۔۔۔ آخر وہ کب تک زمینداروں اور وڈیروں کے رحم و کرم پر رہیں گے؟ اسے ایسی زندگی سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔۔۔ جہاں اندھیرا تھا جہاں غریب انسان بے کس اور مہربان زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اپنے حق کیلئے آواز نہیں بلند کر سکتا تھا۔ اگر ایسی کوئی جرأت کرتا بھی تو اسے دبا دیا جاتا۔۔۔ یا پھر صفحہ ہستی سے ہی مٹا کر رکھ دیا جاتا۔ تف ہے ایسی زندگی پر۔۔۔ اس سے تو اچھا ہے کہ انسان زہر کھا کر مر جائے۔۔۔ مگر میں۔۔۔ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔۔۔ میں اپنے اوپر۔۔۔ اپنے ماں باپ پر عرصہ حیات تنگ کرنے والوں سے ضرور نمٹوں گا ایک دن۔۔۔ ضرور نمٹوں گا۔۔۔ جوش غیظ سے اسے احساس ہی نہ ہوا کہ۔۔۔ آخری الفاظ بے اختیار اس کے لبوں سے پھسل کر۔۔۔ عقب میں گٹھڑی بنی بیٹھی اس کی نو بیا ہتا دلہن کی سماعتوں تک جا پہنچے تھے اور اس نے بے اختیار لاج شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گھبرا کر ایک نگاہ اپنے شوہر کی طرف ڈالی اور بولی۔

”کیا ہوا سائیں؟“ محمد وسان نے یک دم چونک کر عقب میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا پھر جانے کیا سوچ کر اس نے فوراً بیلوں کی رسی کھینچ لی۔ دونوں بیل ہولے سے رک گئے۔ ماحول پر دم نہ خودی خاموشی طاری ہو گئی۔

”نوراں۔۔۔ بابا اور چاچا احمد بخش نے ہمیں کیا نصیحت کی تھی؟“ معا محمد وسان نے گھمبیر لہجے میں اسے مخاطب کر کے پوچھا۔ نوراں کو اگرچہ اپنے شوہر کے

اس عجیب طرز گفتگو پر حیرت ہوئی۔ مگر بولی۔

”انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔ ہمیں سب سے پہلے۔۔۔ وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر میں جا کر اس کے آگے اپنی فریاد ڈالیں اور اسے مدد کی عرضی (درخواست) دیں۔“

”لیکن میں کسی کی مدد لینا نہیں چاہتا۔“ وسان نے تلخ لہجے میں کہا۔ نوراں بے چاری کیا جواب دیتی۔

چپ ہو کے بیٹھی رہی۔۔۔ مگر وسان کو جواب اس کی خاموشی کھل گئی لیکن اس بار وہ نوراں سے قدرے رسان کے ساتھ بولا۔

”نوراں۔۔۔! آخر ہم کب تک دوسروں کے آسروں اور مدد پر چلیں گے؟“

”میں سمجھی نہیں میرے سائیں۔“ نوراں نے بھولے سے کہا۔

”میں نے تجھ سے کوئی فادری بولی ہے۔“ وسان نے چڑچڑے پن سے کہا۔ نوراں بے چاری پریشان ہو گئی۔

”سائیں معاف کر دیں۔۔۔ میں عقل کی کچی ہوں۔“ اس کی معصومت بھرے لہجے پر وسان کو بے اختیار اس پر ترس بھی آیا۔ وسان خود پریشان تھا۔۔۔ اس کا چڑچڑاپن اس کیفیت کا مظہر تھا؟ تاہم وہ اپنے لہجے میں پیار بھری رسائیت سموتے ہوئے اس سے دوبارہ بولا۔

”نوراں۔۔۔! تو نے کبھی سوچا ہے کہ۔۔۔ ہمارے اس طرح کوٹھ سے چپ چپاتے نکل جانے کے بعد۔۔۔ بابا اور چاچا پر کیسی کیسی قیامتیں ڈھائی جائیں گی۔۔۔ انہیں کس قدر آزار پہنچایا جائے گا۔۔۔ پپ۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ پھر وہ زندہ بھی بچ سکیں گے یا۔۔۔“ وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکا تھا اچانک نوراں نے بلک بلک کر روتا شروع کر دیا۔ وسان پریشان ہو گیا۔

”اڑی چری۔۔۔۔ اروتی کیوں پڑی ہے؟ اب سمجھ میں آئی نامیری بات۔۔۔۔ یہ سب ہم غریبوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔۔۔۔ ظلم کرنے والے بھی ایسے ہی ہیں اور مدد کرنے والے بھی۔۔۔۔ تو کیوں نہ پھر ہم اپنے نصیبوں کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑنے کی بجائے خود کریں۔“ اسے حالات کا سنگین تجربہ ہوا تھا بے چاری سیدھی سادی نورائیں کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی مگر خوف سے چپکی بیٹھی رہی۔

”نورائیں!۔۔۔۔ اگر ہم وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر نہ جائیں تو تجھے اعتراض تو نہ ہوگا؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

نورائیں بولی۔ ”سائیں! اب تو میرا سب کچھ تو ہی ہے۔۔۔۔ جدھر لے جائے۔۔۔۔ جو کرے۔۔۔۔ میرا جینا مرنا اب تیرے ساتھ ہے۔“

وسان اس کی بات پر خوش ہو گیا۔ ”یہ ہوئی نابات۔۔۔۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو تجھے بہادر بننا ہوگا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ پر سائیں! بابا اور چاچا کی طرف سے تو نے مجھے فکر میں ڈال دیا ہے۔۔۔۔ اگر زمیندار دریا خان اور گہرام نے ان گریبوں کو۔۔۔۔ وہ مارے غم کے اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی اور ایک بار پھر سسک پڑی۔

وسان نے اسے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ”نورائیں!۔۔۔۔ تو فکر نہ کر۔۔۔۔ پہلے ہم کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ پھر ان کا بھی کچھ سوچ لیں گے۔“

”پر سائیں!۔۔۔۔ ہم جائیں گے کہاں۔۔۔۔؟ ہم کو کون پناہ دے گا۔۔۔۔؟“ نورائیں نے ایسا سوال کیا جس کا جواب وسان کے پاس بھی نہ تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ نورائیں اسے خاموش پا کر بولی۔

”سائیں! تو پھر کیوں نہ ہم وڈیرے پیارو خان کے پاس چلے جائیں۔ ہم اپنے گھر والوں کے لیے تو اس سے مدد لے سکتے ہیں۔“

محمد وسان جواباً خاموش رہا، لگ رہا تھا جیسے اسے نورائیں کا مشورہ برا نہیں لگا

تھا مگر۔۔۔۔ درحقیقت ایسا تھا نہیں۔۔۔۔ کیوں کہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی نوپا ہوتا بیوی نورائیں سے جو عندیہ لینا تھا وہ لے لیا تھا۔ بس اس کے لیے یہ کافی تھا اس نے نورائیں کو جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ دوبارہ تیل گاڑی کی رسی تھام لی۔ جنگل میں رات کے دم بہ خود اندھیروں میں اندیشوں بھرا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

محمد وسان اب نورائیں کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ لہذا اس نے اب وڈیرے پیارو خان کی جاگیر جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا مگر اب نورائیں کا عندیہ لینے کے بعد اس نے یہی سوچا تھا کہ یہاں سے سیدھا اپنے دوست درمحمد کے ہاں جائے گا اور پھر وہیں ڈیرا جمانے کے بعد وہ اپنے ماں باپ وغیرہ کی خبر لے گا۔ اس کے دوست درمحمد کا گوٹھ زیادہ دور نہیں تھا اور تاہی دریائے سندھ کے دوسری طرف تھا۔۔۔۔ بس یہاں سے چند ہی میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے پر اس کا گوٹھ تھا۔ وہاں تک پہنچنے کا حتمی فیصلہ کرنے کے بعد اب تیل گاڑی کی رفتار اس نے تیز کر دی۔

مشرق افق سے سپیدہ نمودار ہونے کے بعد وہ اپنے مطلوبہ گوٹھ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ نورائیں رلی اور ہسے تیل گاڑی کے پرال بھرے چوبی تختے پر سسکری سسکی سو رہی تھی۔

کھیتوں میں ہاری عورتیں اور مرد کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ انہیں کام میں مشغول دیکھ کر محمد وسان کے جھانکشی وجود میں دکھ اور احساس محرومی کی لہر ابھری۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ زمین کا سینہ چیرنے میں مصروف ہو جائے۔ مگر راضی نا خداؤں نے اس کے معصوم اور محنت کش شب و روز کو سیاہ آندھیوں کی نذر کر ڈالا تھا اسے پہلے دن سے سیاہ آندھیوں کا مقابلہ کرنا تھا مگر۔۔۔۔ محمد وسان نے دل میں اپنے تئیں فیصلہ کر لیا تھا کہ حالات کا مردانہ وارڈٹ کر مقابلہ کرے گا۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد

محمد وسان نے ایک کچے گھر کے سامنے تیل گاڑی روک دی۔ دیواروں پر اگلے تھے ہوئے تھے دروازے پر پردے کے نام پر ٹاٹ جھول رہے تھے۔

اس ٹاٹ کو پڑے ہٹاتا ہوا ایک مجھول سا بوڑھا کانپتا ہوا باہر نکلا اس کے کچھی سے ہاتھ کی استخوانی مٹھی میں بیڑی دبی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دروازے کے سامنے ایک تیل گاڑی کو کھڑے دیکھ کر ڈرائنگ گیا۔

”چاچا فضل۔۔۔۔! اسلام وعلیکم!“ محمد وسان نے تیل گاڑی سے اترتے ہوئے اسے سلام کیا۔ نورائیں بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ اور کسمسا کر اپنی اجرک کی چادر کو سر پر درست کرنے لگی۔

”بسم اللہ بابا۔۔۔!“ چاچا فضل نامی اس بوڑھے نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا چھبسا بنا کر اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جوابا کہا۔ وسان نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”اڑے چھو کر۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ محمد وسان۔۔۔ کیا ہے تو؟“ محمد وسان کے قریب آنے پر چاچا فضل اسے پہچان کر خوشی سے بولا۔ ”بس چاچا۔ اللہ سائیں کا کرم۔۔۔ در محمد گھر پر ہے کیا؟“ وسان نے پوچھا۔ تو چاچا فضل نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر سامنے بیٹھی گٹھڑی بنی بیٹھی نورائیں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ کون ہے۔۔۔ کیا تیری زال (بیوی) ہے۔“ ”ہاؤ چاچا! تو نے ٹھیک اندازہ لگایا۔“ وسان جلدی سے بولا۔ ”تو لے آ۔۔۔ اسے اندر چھو کر۔۔۔“ وہ بولا اور پھر اندر چلا گیا۔ ”اڑے او۔۔۔ در محمد۔۔۔ تیرا دوست آیا ہے ڈبے۔۔۔“ اس نے بیٹے کو آواز دی تھی۔

”نورائیں۔۔۔ نیچے اتر آ۔۔۔ آجا اندر تو بھی۔“ وسان نے وہیں دروازے ہی سے اپنی بیوی کو پکارا۔ اور نورائیں اسے کچھ ضروری سامان پہلے ہی اندر

لے جانے کی تاکید کرتے ہوئے اپنی بچی سنبھالے تیل گاڑی سے اتر آئی۔

فضل چاچا کا گھر زیادہ بڑا نہ تھا بلکہ اس کا تو صحن بھی تنگ تھا اور وہاں بس ایک دو دھیلی بھینس نے گھر کر رکھا تھا۔ نیم پختہ اینٹوں کے دو کوٹھری نما کمرے سامنے نظر آ رہے تھے۔ صحن میں ایک جھلنگا سی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس پر بیٹھ گئے۔ وسان اپنا جست کا صندوقچہ اتار لایا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک دوسری کوٹھری سے وسان کا ہم عمر ایک نوجوان آنکھوں کا چپڑ نکالتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ اس کا دوست در محمد تھا۔ اس نے میلی سی قمیض اور راک (تہبند) باندھ رکھی تھی۔ وسان کو دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا۔ پھر جلدی سے اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

”بھلی کرے آیا سنگت!“ (خوش آمدید دوست) دونوں دوست بغل گیر ہوئے۔

”یہ میری گھر والی ہے نورائیں۔“ محمد وسان نے اسے بتایا۔ ”بھاجائی۔۔۔ السلام۔“ در محمد نے نورائیں کے سر پر روایتی انداز میں اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے اس سے کہا اور نورائیں سر جھکائے خاموش رہی۔ اتنے میں در محمد کے باپ نے اس سے کہا۔

”پٹ! تو ان دونوں کے لیے مانی نکر (روٹی وغیرہ) کا بندوبست کر۔ میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ در محمد اور اس کا باپ دنیا میں اکیلے تھے۔ در محمد کی ماں کا حال میں ہی انتقال ہوا تھا۔ در محمد ابھی غیر شادی شدہ تھا البتہ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ ”اچھا سنگت! تم دونوں اندر کوٹھری میں جا کر آرام کرو۔ میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”تو تکلیف نہ کر نورائیں کر لے گی۔ تو نے ابھی چاچا کے ساتھ ڈیرے پر جانا ہے تو ہوا۔“

وہی ہوا۔ معاً اس کی نگاہ سامنے والے کھیتوں کے درمیان بل کھاتی پگڈنڈی پر پڑی اور وہ بری طرح دہل گیا۔ اس نے ذرا فاصلے پر کام کرتے ہوئے اپنے بھائی مٹھل کو آواز دی۔

”بھامٹھل ہوشیار۔“ اس کی آواز میں ان جانے خوف کا ارتعاش تھا۔ مٹھل نے بھائی کی آواز پر کٹائی کے دوران سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی اسے مذکورہ پگڈنڈی پر ایک بغیر ہڈ کی جیب آتی دکھائی دی۔ احمد بخش فوراً اپنے بھائی مٹھل کی طرف کھسک آیا۔ پھر دونوں سہمی ہوئی نظروں سے آتی ہوئی جیب کو دیکھتے گئے۔ جیب ان کے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رکی۔ دونوں بھائیوں کے دل بوڑھے سینوں میں لرزنے لگے۔ جیب سے چار افراد کد اکڑے مار کر اتر آئے۔ وہ چاروں اجرک پوش تھے۔ تین تو خاصے محیم شمیم تھے جب کہ چوتھا ایک منحنی منحنی ٹائپ شخص تھا۔ اس نے الوؤں کے دیدوں جیسی عدسوں والی عینک چڑھا رکھی تھی۔ دو کے کاندھوں پر رانقلیں اور تیسرے محیم شمیم شخص کے بغل سے ہولٹر جھول رہا تھا۔ یہ گہرام تھا، زمیندار دریا خان کا خاص الخاص آدمی اور منحنی شخص اس کا منشی مور یو خان تھا۔ باقی دو کی حیثیت ان کے کارندوں کی سی تھی۔ گہرام اور منشی سرد نظروں سے ہاری احمد بخش کی طرف گھورتے ہوئے ان کے قریب آئے تو دونوں بھائیوں نے اپنے ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا۔

”اڑے بابا۔۔۔ احمد بخش! ہم آخری جواب لینے آئے ہیں تیرے سے اس وقت بول کیا جواب ہے تیرا؟“ گہرام نے خشک لہجے میں اس سے کہا۔

”سائیں! گھر چلو آرام سے اوطاق میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ تو مٹھل جلدی سے عاجزانہ لہجے میں بولا۔

”اڑے چپ کر۔“ منشی مور یو خان نے اسے کرخت لہجے میں جھڑکا۔ پھر احمد بخش سے مخاطب ہو کر بولا۔

وسان نے اس سے کہا تو وہ فراخ دلی سے مسکرا کر بولا۔ ”اڑے نہیں سنگت! کیوں بھاجائی کو تکلیف دیتا ہے۔ چل اٹھ اندر جا کر آرام کرو۔ جاؤ شاباش۔“

وسان بے اختیار مسکرایا پھر نوراں کو لیے اندر کوٹھری میں آ گیا۔ یہاں ایک رلی پچھی چار پائیاں دھری تھیں۔ دونوں میاں بیوی ان پر لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد در محمد نے وسان کو آواز دی۔ وہ باہر نکلا تو در محمد کھانے کے برتن لیے کھڑا تھا۔

”یہ لے کھانا حاضر ہے۔ کھاپی کر آرام کرو۔ میں ڈیرے سے جلد لوٹ آؤں گا۔ اور ہاں بھاجائی کو کام نہ کرنے دینا۔ مجھے باورچی خانے کا خوب تجربہ ہے میں سنبھال لوں گا۔ ویسے خیر تو ہے ناں۔“ اس نے آخر میں پوچھ ہی لیا۔ وسان نے اس کے ہاتھوں سے ناشتے کے برتن پکڑتے ہوئے بولا۔

”ہاؤ یار سنگت! بس خیر ہے بھی اور نہیں بھی۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا تھا پر تو پریشان نہ ہو۔ میں آتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ در محمد نے نشئی آمیز لہجے میں اس سے کہا اور پھر کام پر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن کی صبح اندیش ناک تفکرات اور وسوسہ انگیز متوحش خیالات سے طلوع ہوئی تھی۔ دونوں بھائی یعنی مٹھل اور احمد بخش بہ ظاہر معمول کے مطابق کھیتوں پر کام کرنے چلے گئے تھے اندر سے وہ دونوں بے چارے ڈرے ہوئے تھے۔ بالخصوص نوراں کا باپ احمد بخش کچھ زیادہ ہی ڈرا سہا ہوا تھا۔ دونوں کے بشروں پر بے نام سے خوف کی کھٹک ہوید ا تھی۔ تاہم دونوں اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور اس دوران احمد بخش کبھی کبھی اطراف میں ایک متوحش سی بھی نگاہ ڈالتا جا رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے صاف لگ رہا تھا جیسے اسے کسی طوفان کی آمد کا اندیشہ ہو اور پھر

”ہاں بابا! پھر کیا کہتا ہے تو۔۔۔ کیا تجھے یہ رشتہ منظور ہے؟“

”س۔۔۔ سائیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ہ۔۔۔ بات۔۔۔“

بے چارے احمد بخش سے خوف کے مارے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ چاروں اسے خشم ناک نظروں سے گھورنے لگے۔ احمد بخش نے بہ مشکل اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”س۔۔۔ سائیں!۔۔۔ میں نے پہلے ہی تم لوگوں سے کہا تھا کہ۔۔۔ میں نے اپنی دہی (بیٹی) نورائیں کی منگنی اپنے بھائی مٹھل کے بیٹے محمد وسان سے کر دی ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ ان دونوں کی تو۔۔۔ اب۔۔۔ شادی بھی ہو گئی ہے۔“

ہاری احمد بخش کے الفاظ گہرام اور منشی مور یو خان کے سر پر ہم کی طرح پھٹے تھے۔

”کیا بکواس کرتا ہے تو؟“ گہرام نے غیظ ناک لہجے میں چنگار برساتی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

ہاری احمد بخش غریب سہم کر رہ گیا۔ مٹھل بھی بے چارہ گہرام کی قہر باری پر تھوک نکل کر رہ گیا۔ کیوں کہ اسی لمحے گہرام نے احمد بخش کے ساتھ اس کی طرف بھی ایک خوں خوار نظر ڈالی تھی۔ گویا اس نے اپنے بیٹے محمد وسان کی شادی نورائیں سے کر کے کوئی بہت بڑا جرم کر ڈالا ہو۔

”احمد بخش!۔۔۔ تو نے اچھا نہیں کیا۔“ اس بار منشی مور یو خان نے ابلتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم پھکو موالی کے لیے نورائیں کا سنگ (رشتہ) لینا چاہتے تھے۔ پھر تم دونوں نے ایسا کیوں کیا۔“ اس بار احمد بخش کی بجائے مٹھل ذرا ہمت کر کے بولا۔

”س۔۔۔ سائیں!۔۔۔ ان دونوں کی تو پ۔۔۔ پہلے ہی سے۔۔۔“

”اڑے بس کر۔۔۔ میں تو تم دونوں سے بعد میں نمٹوں گا۔ پہلے یہ

بتا۔۔۔ گواہ بننے کی جرأت کس نے کی تھی۔“

گہرام نے آگ اگلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ دونوں بے چارے سہمے ہوئے ایک دوسرے کا چہرہ تکتے لگے۔

”چلو منشی۔۔۔! ذرا اس خدا بخش کے پاس چل کر پوچھتے ہیں۔“

ان دونوں کو متذہب پاکر گہرام نے منشی سے کہا اور پھر وہ دونوں قہر آلود نظروں سے احمد بخش اور مٹھل کو گھورتے جیب میں جا بیٹھے۔ جیب ایک جھٹکے سے اشارت ہو کر آگے بڑھ گئی۔

گوٹھ کے پیش امام خدا بخش کا گھر مسجد کے قریب ہی تھا۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ اس کی اکلوتی بیٹی۔۔۔ مول دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ خدا بخش نے اسے روکا وہ اس وقت صحن میں بیٹھی چار پائی پر روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے بآواز بلند کہا۔

”صبر کر ذرا۔۔۔ میں روٹی کھا کر آتا ہوں۔“ مول واپس رسوئی کی طرف

بڑھ گئی۔۔۔ وہ ایک سولہ سالہ جوان لڑکی تھی۔ اس کی ماں کو فوت ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹی کا دنیا میں اللہ کے سوائے کوئی نہ تھا۔ خدا بخش نے کھانا کھا کر شکر الحمد للہ کہا اور پھر چار پائی سے اٹھ کر اس نے نا پختہ صحن کے ایک کونے میں ہاتھ دھوئے پھر انہیں پونچھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو وہ ذرا چونک سا گیا۔ سامنے گہرام اور زمیندار دریا خان کا منشی مور یو خان کھڑے تھے۔

”اسلام و علیکم۔“ خدا بخش نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں سلام کیا۔

”محمد وسان اور نورائیں کا نکاح تو نے ہی پڑھایا تھا۔“ گہرام اس کے سلام کا

امام خدا بخش نارمل انداز میں کھڑا تھا۔

”خدا بخش بیٹھ جاؤ۔“ دفعتاً اعصاب شکن خاموشی میں زمیندار دریا خان کی کھر کھراتی آواز ابھری اور خدا بخش خاموشی سے سامنے دھرے ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ جب کہ دل مراد اور سائیں داد کھڑے رہے تھے۔

”خدا بخش! تم بے شک گوٹھ کی ایک معزز شخصیت ہو۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہمارے ہاریوں کے ساتھ اس طرح کی ساز باز کرو۔“

زمیندار دریا خان نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کھر کھراتے لہجے میں شکوہ کیا۔

جواباً خدا بخش نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔ ”میں نے ساز باز نہیں کی ہے۔“

”تو پھر یہ چوری چھپے نکاح پڑھوانے کا کیا مطلب ہے یہ تو اخلاقاً اور قانوناً جرم ہے۔“

”بعض حالات میں جب شر یا فساد پھیلنے کا خدشہ ہو تو یہ جائز ہے۔“ خدا بخش نے مطمئن لہجے میں کہا۔ دریا خان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کے ابال پہ بمشکل قابو پائے ہوئے تھا جس کی غمازی اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے تاثرات سے بہ خوبی ہو رہی تھی۔

”میں فضول تکرار کا عادی نہیں ہوں مولوی۔۔۔!“ اس بار زمیندار دریا خان کے لہجے میں تضحیک آمیز نخوت عیاں تھی۔

”اب آگے وہی کرنا ہے جو ہم کہیں گے۔“

”تمہیں شاید علم نہیں کہ ہاری حسین بخش کی بیٹی نوراں کی بات پھکو موالی نامی ایک شخص کے ساتھ چل رہی تھی۔۔۔ مگر احمد بخش نے اپنے بھائی مٹھل کے دباؤ میں آ کر اپنی بیٹی نوراں کا نکاح اپنے بھائی مٹھل کے بیٹے محمد دسان سے کر ڈالا جو

جواب دیے بغیر خاصی درشتگی سے بولا۔ تو پیش امام خدا بخش نے بہ آواز بلند کہا۔

”الحمد للہ۔۔۔ یہ نیک سعادت مجھ گناہگار کو ہی نصیب ہوئی تھی۔“

”کتنے روپے اینٹھے تھے تم نے۔۔۔؟“ گہرام کے لہجے میں استہزائیہ خوں خواری تھی۔

”روپے نہیں ہدیہ کہو۔۔۔ جو ملا قبول کیا۔“ خدا بخش نے بہ دستور تحمل سے جواب دیا۔

”گواہ کتنے تھے اور کون تھے وہ مائی کے لال جنہوں نے یہ جرأت کی۔“

”دل مراد۔۔۔ سائیں داد گواہ تھے۔“

”بس ہم نے یہی پوچھنا تھا۔“ یہ کہہ کر گہرام اور منشی واپس لوٹ گئے۔ خدا بخش کے چہرے پر پہلی بار الجھن آمیز تفکر کے تاثرات ابھرے تھے۔

☆.....☆.....☆

کوئی پون گھنٹے کے بعد دل مراد اور سائیں داد۔۔۔ پیش امام خدا بخش سمیت زمیندار دریا خان کی اوطاق میں موجود تھے۔ ایک قدرے اونچی پشت والے سر کندوں کے موڑھے (موٹے) پر زمیندار دریا خان اپنی روایتی بھاری بھر کم شخصیت کے ساتھ بڑے ”مگر“ سے براجمان تھا۔ اس کے سر پر سرخ شیشوں کے کام والی ٹوپی اور شانوں پر ہالا کی اصل بیش قیمت اجرک دھری تھی۔ بڑی بڑی خم دار مونچھوں کی طرح اس کی بھنوس بھی خاصی گھنی اور دسمہ لگی ہوئی تھیں۔ وہ درشت نظروں سے ان تینوں کی طرف گھور ہا تھا۔ اور اس کے برابر والے نسبتاً چھوٹے موڑھے پر گہرام بھی براجمان تھا۔ جبکہ منشی مور یو خان قریب ہی ایک بڑی سی چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔

پیش امام خدا بخش کے ساتھ کھڑے نکاح کے دونوں گواہ دل مراد اور سائیں داد کے چہروں پر قدرے خوف اور گہرا ہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ البتہ پیش

سراسر ایک دھوکا ہے لہذا اب تمہارے پاس دو ہی صورتیں ہیں یا اس نکاح کو فوراً منسوخ کر دیا پھر صاف مکر جاؤ۔“

اپنا خود ساختہ فیصلہ مولوی خدا بخش کے سر پر مسلط کر کے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر۔۔۔ زمیندار دریا خان فوراً ہی اپنے سامنے ڈرے سہمے کھڑے دل مراد اور سائیں داد سے گونجی اور کرخ آواز میں بولا۔

”اور۔۔۔ تم دونوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ سن رہے ہو تم دونوں بھی میری بات۔۔۔“

زمیندار دریا خان کے گردار لہجے میں موجود خوف کو محسوس کر کے دل مراد اور سائیں داد فوراً اپنے ہاتھ جوڑ کر لجا جت سے بولے۔

”حاضر سائیں وڈا۔۔۔ برابر سائیں وڈا!۔۔۔ جیسا آپ کا حکم ہو۔“
مولوی خدا بخش نے ایک ناگواری نگاہ ان دونوں پر ڈالی اور پھر زمیندار دریا خان کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی سنجیدگی سے اٹل لہجے میں بولا۔

”معاف کرنا سائیں!۔۔۔ میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا۔۔۔ ان دونوں کا نکاح ہو چکا ہے۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔“

مولوی خدا بخش کے حتمی لہجے پر زمیندار دریا خان سمیت۔۔۔ گہرام، منشی سورپو خان اسے خشکی نظروں سے گھورنے لگے۔

پھر زمیندار دریا خان نے خوں خوار لہجے میں کہا۔
مولوی۔۔۔! تم جاسکتے ہو۔“ مولوی خدا بخش خاموشی سے چلا گیا۔

”تم دونوں اپنی بات پر قائم رہنا اور یہ بھول جانا کہ تم اور وہ مولوی خدا بخش یہاں آئے تھے۔

”برابر سائیں۔۔۔ برابر۔۔۔“ دل مراد اور سائیں داد نے اپنے مخصوص

جی حضوری والے انداز میں کہا اور پھر جیسے جان بخشی کا پروانہ ملتے ہی چلے گئے۔
”سائیں بھوتاریہ۔۔۔! یہ کیا؟ آپ نے اس مولوی کو ایسے ہی آرام سے جانے دے دیا۔“

گہرام نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ تو زمیندار دریا خان کے بھاری بھر کم اور رعوت بھرے چہرے پر بڑے خوف ناک تاثرات ابھرے پھر۔۔۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقصاں ہوئی اور وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

”اڑے چھوڑ! تو ان خزانہ قسم کے مولویوں کو نہیں جانتا۔۔۔ میں نے ان کا بندوبست سوچ لیا ہے۔“

”مگر سائیں! اس کا تو بندوبست، ہوتا رہے گا۔۔۔ اب ان دونوں چھوری اور چھو کرے (نوراں اور محمد وسان) کا بھی کچھ سوچنا چاہیے ہمیں۔۔۔“ منشی مورپو خان نے جیسے یاد دلایا۔

”ہاں۔۔۔ اڑے گہرام۔“

”حاضر سائیں۔“

”بابا۔۔۔! تم ایسا کرو۔۔۔ ہر نامی کھوجی کے ہاں جاؤ۔۔۔ اسے راز داری میں لے کر ذرا دونوں کے ”پیرے“ تلاش کرنے کا کہو۔ پھر نوراں اور وسان کا سراغ ملتے ہی وسان کو موت کے گھاٹ اتار دو اور چھو کرے نوراں کو۔۔۔ اٹھا کر لے آؤ۔۔۔ تمہارا کام ہو گیا۔“ زمیندار دریا خان نے سفاک لہجے میں کہا اور پھر تینوں کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔

☆.....☆.....☆

حسب معمول۔۔۔ سرشام ہی گوٹھ پر رات کی سیاہ چادر تن گئی تھی۔ دور کھیتوں اور بنجر ویرانوں کی طرف سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آنے

گلی تھیں۔۔۔ چاچا فضل اپنی کوٹھری میں ذرا دیر تک خشک تمباکو کی گڑ گڑی لگانے کے بعد کھڑی کھاٹ پر سوچا تھا۔ دوسری کوٹھری میں نورائیں اس کا شوہر محمد وسان آئے سانسے رلی پتھی چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔ درمحمد وسان کے ساتھ اس کی چار پائی پر بیٹھا تھا۔ کوٹھری کے اندر ایک سائبان کے کٹر پر جھولتی لائین کی ریرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تینوں کے چہرے دم بہ خود خاموشی میں مستغرق تھے۔ ان کے گم صم مگر پر سوچ چہروں کے تاثرات سے بہ خوبی اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ۔۔۔ ذرا دیر پہلے ان کے درمیان انتہائی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو ہوتی رہی ہے اور اب یہ جیسے۔۔۔ آئندہ کے کسی لائحہ عمل کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی محمد وسان۔۔۔ اپنے دوست درمحمد کو ساری حقیقت سے تفصیلاً آگاہ کر چکا تھا۔

”سنگت۔۔۔! تم دونوں کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ اللہ بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکالے گا۔“

بالا خر خاصی دیر بعد جب ان مندوش حالات سے چھٹکارا کی کوئی راہ بھائی نہ دی تو۔۔۔ درمحمد نے محمد وسان کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے اس سے ازراہ تشفی کہا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ خود وہ بھی محمد وسان اور نورائیں کی لرزہ خیز داستان سے پریشان تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر کس طرح ان بے چاروں کی داد دینی کرنے کی کوششیں کر سکتا ہے؟

”یا در محمد! اللہ ہی کے آسرے پر تو اب تک میں اور نورائیں زندہ ہیں۔“ بالا خر وسان نے کہا۔

”مگر مجھے خود سے زیادہ۔۔۔ بابا لوگوں کی فکر ستار ہی ہے۔ کمینہ نشی موریو اور زمیندار دریا خان اور گہرام نے ان بے چاروں کا ناک میں دم کر دیا ہوگا۔“

”اڑے سنگت! بابا اور چاچا والوں کو بس تیرے ساتھ ہی وہ گوٹھ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔۔۔ ویسے ہے تو یہ بھی فکر کی بات۔۔۔ نشی اور گہرام ان بے چاروں کو خوب

ستار ہے ہوں گے۔“

درمحمد نے تاسف سے کہا تو محمد وسان اور بھی بے چین اور متشکر ہو گیا اور یکدم فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”یار در محمد!۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ صبح سویرے جا کر بابا اور چاچا کو میں ادھر ہی لے آؤں گا۔“

”نہیں۔۔۔ تو اب وہاں مت جانا۔۔۔ وسان!“ درمحمد نے نفی میں سر ہلا کر بولا۔

”میں اپنے بابا کے ساتھ جاؤں گا۔۔۔ اور۔۔۔“

”نہیں چاچا فضل کو ادھر ہی رہنا چاہئے۔۔۔ ہم دونوں چلیں گے۔“ محمد وسان اس کی بات کاٹ کر اٹل لہجے میں بولا۔

نورائیں اپنے شوہر کے فیصلے پر اندر سے پریشان ہو گئی۔ مگر بولی کچھ بھی نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح سویرے ہی درمحمد اور وسان نکل پڑے درمحمد نے اپنے باپ فضل کو گھر میں ہی نورائیں کے پاس رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس لیے فضل گھر پر ہی موجود تھا اور نورائیں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ مگر وہ اندر سے جانے کیوں متوحش سی تھی ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں گھر کیے ہوئے تھا۔ جیسے اب تب میں کوئی قیامت ٹوٹنے والی ہو۔۔۔ کہتے ہیں بعض انسانوں کی چھٹی حس بہت طاقتور ہوتی ہے۔ نورائیں بھی شاید ایسی ہی عورتوں میں سے تھی۔ وہ صحن کے ایک کونے میں رات کے بکھرے پڑے برتن مانجھ رہی تھی کہ اچانک دروازے کو باہر سے کسی نے زور زور سے دھڑ دھڑایا۔ چاچا فضل اس وقت حسب معمول کچے صحن کے وسط میں پتھی چار پائی پر بیٹھا گڑ گڑائی جمانے میں مصروف تھا، وہ وہیں چار پائی پر مست الست بیٹھا

زور سے کرکرایا۔

مٹھل اپنے بیٹے محمد وسان کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس کا بھائی احمد بخش بھی آج کل اپنی بیوی عجمیاں کے ساتھ وہیں رہائش پذیر تھا۔ دونوں اس وقت کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

”اڑے چھو کر! تو یہاں آ گیا۔“ مٹھل نے خوف زدہ لہجے میں اپنے بیٹے وسان سے کہا۔

”اڑے بابا۔۔۔ انوراں کدھر ہے۔۔۔ وہ ٹھیک ہے نا؟“
اس کے سر احمد بخش نے پریشان ہو کر پوچھا۔ تو در محمد دونوں سے تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

”چاچا۔۔۔ تم لوگ فکر نہ کرو بھاجائی نوران۔۔۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”بابا۔۔۔! تم لوگ کیسے ہو۔۔۔ اس کمینے گہرام اور نشی مور یو خان نے تم لوگوں کو تنگ تو نہیں کیا؟“ محمد وسان نے تکرر بھرے لہجے میں پوچھا۔

اثنائے راہ اس کی ماں حیاتاں اور ساس چاچی عجمیاں بھی رسوئی سے نکل آئیں۔

”پٹ وسان! تو ہماری فکر نہ کر۔۔۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔ پر تو بتا حاجی پیارو خان کے پاس گیا تھا یا نہیں۔۔۔؟“

”نہیں بابا۔۔۔! میں اپنے دوست در محمد کے ہاں ٹھہرا ہوں اور نوران بھی بالکل خیریت سے ہے وہاں۔۔۔“

”اڑے بابا یہ کیا پھیر کر دیا۔۔۔؟ وہ تو دونوں کو بھوکے کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔۔۔“ مٹھل یک دم پریشان ہو کر بولا۔

”بابا۔۔۔! آخر ہم کب تک ان بھوکے کتوں سے ڈرتے رہیں گے؟“ وسان نے تلخ لہجے میں کہا۔

”کون ہے بابا۔۔۔! کیا دروازہ توڑو گے۔۔۔ آ رہا ہوں۔“
یہ بڑبڑاتا ہوا وہ چارپائی سے اٹھا۔ کونے میں برتن دھوتی ہوئی نوران متوحش سی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ادھر فضل نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ نوران کے حلق سے بے اختیار ہندیانی چیخ ابل پڑی۔ کیونکہ بابا فضل کو زور سے دھکا دیتے ہوئے چارپانچ ڈھانا پوش اندر داخل ہوئے تھے۔ نوران۔۔۔ کوٹھری کی طرف بھاگی، مگر دو ڈھانا پوشوں نے اسے راستے میں ہی دیوچ لیا اور ایک نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بابا فضل نے جو دیکھا تو وہ اپنی تکلیف بھلا کر۔۔۔ ان پر جھپٹا۔۔۔ اس کے بوڑھے وجود میں اچانک ہی عجیب سی طاقت عود کر آئی تھی۔ نوران اس وقت اسے اپنی بیٹی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے جھپٹ کر ایک کے ڈھانے پر ہاتھ مارا تو وہ کھل گیا۔ اور نوران گہرام کو پہچان کر لرز اٹھی۔

”چھوڑ دے میری دھی (بیٹی) کو۔۔۔ ورنہ پورے گوٹھ کو اکٹھا کر لوں گا۔“
”تو زندہ رہے گا تو گوٹھ والوں کو اکٹھا کرے گا نہ بڑھے۔۔۔“

گہرام نے دانت پیس کر کہا اور پھر اپنے نیفے سے خم دار گیراری والا چاقو نکال کر بابا فضل کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ خون کا ایک فوارہ بابا فضل کے پیٹ سے چھوٹا اور پلک جھپکتے ہی کچے صحن میں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ نوران کی چیخ سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئی تھیں۔ پھر بابا فضل کو خون میں لت پت دیکھ کر وہ گہرام اور اس کے ساتھی ڈھانا پوش کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

ذرا ہی دیر بعد گہرام اور اس کے ساتھی بے ہوش نوران کو باہر کھڑی جیپ میں ڈالے آنا فانا وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

محمد وسان اور در محمد کسی طرح چھپتے چھپاتے صبح اپنے مطلوبہ گوٹھ جا پہنچے بوڑھا

”اڑے بھا۔۔۔ احمد بخش۔۔۔ تو ہی اس چھو کرے کو سمجھا۔۔۔۔۔ کہ یہ
یہاں سے چلا جائے۔“ بوڑھا مٹھل قریب کھڑے اپنے بھائی سے بولا۔ وہ بھی متحکک
اور پریشان نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔ وسان کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

”پٹ! تو ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھے گا۔۔۔ ابھی تو جوان ہے۔۔۔۔۔ جب تو
بھی بچوں والا ہو جائے گا ناں۔۔۔۔۔ پھر تجھے معلوم ہو گا کہ ان کتوں سے ہم کیوں
ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ دیکھ ہماری بات مان لے۔۔۔ میں تیرا چا چا ہوں سہرا
(سر) بھی۔۔۔۔۔ تو چلا جا یہاں سے۔۔۔۔۔“

اس دوران وسان کی ماں حیاتاں اور چاچی ساس بھی روتی ہوئی اس کی
منت کرنے لگیں۔

”پٹ وسان! تو چلا جا۔۔۔۔۔ ہم تجھے اور دھی نوراں کو مصیبت میں نہیں دیکھ
سکتے۔“

”مگر۔۔۔۔۔ تم لوگوں کو میں ان کتوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ
دوں۔۔۔۔۔ میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی۔“

وسان جھنجھلاہٹ آمیز پریشانی سے بولا تو اس کا باپ مٹھل دوبارہ باتجی لہجے
میں بولا۔

”ارے بابا! ہم بڑھوں کو کوئی کیا کہے گا۔ تم زندہ ہو تو ہم بھی زندہ ہیں۔ جا
چلا جا۔۔۔۔۔ ہمیں ادھر ہی پڑا رہنے دے۔ حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ہم بھی
تمہارے پاس آ جائیں گے۔۔۔۔۔ تم اپنا ٹھکانہ تو بنالو۔“

باپ کی بات سن کر محمد وسان تذبذب کا شکار ہو گیا۔ پھر اس کے دوست
درمحمد نے بھی وسان کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”چلو سنگت (دوست)۔۔۔۔۔! یہ لوگ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آؤ۔۔۔۔۔ کہیں
ہماری وجہ سے یہ گریب بھی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔“

وسان نے ایک دکھ بھری نگاہ اپنے گھر والوں پر ڈالی اور پھر خاموشی سے
واپس لوٹ آیا۔ ہاری مٹھل اور احمد بخش نے وسان کو زمیندار دریا خان کے ہاں اپنی
طلبی اور گہرام وغیرہ کی دھمکیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

درمحمد وسان کے ساتھ دوبارہ اپنے گوٹھ کی طرف چل دیا۔
جب یہ لوگ گھر پہنچے تو اچانک انہوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کے رستے
میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ دونوں پریشان ہو گئے۔ پھر دونوں ہی ہجوم کو چیرتے ہوئے
اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دھک سے رہ گئے۔ درمحمد کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں بچھی
چار پائی پر اس کے باپ فضل کی خون آلود لاش پڑی ہوئی تھی۔ جس پر چادر ڈھانپ
دی گئی تھی۔

”بابا۔۔۔۔۔!“ درمحمد دکھ بھری چیخ مار کر باپ کی لاش سے لپٹ گیا اور پھوٹ
پھوٹ کر رو دیا۔

وسان کی پر تشویش نظریں نوراں کو تلاش کرنے لگیں۔ مگر وہ اسے نہ ملی۔ تب
کسی نے بتایا کہ ”کچھ ڈھانا پوش افراد ایک بے ہوش جوان عورت کر جیپ میں
ڈالے لے گئے ہیں۔ پھر جب گوٹھ کے چند لوگ اس کے گھر میں داخل ہوئے تو
انہیں۔۔۔۔۔ چاچا فضل کی صحن میں پڑی خون آلود لاش نظر آئی۔“

یہ سن کر۔۔۔۔۔ وسان ہکا بکا رہ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے
چنگاڑیاں پھوٹنے لگیں اور اس کی شعلہ فشاں نظروں کے سامنے گہرام کا مکروہ چہرہ
رقصاں ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ حرکت گہرام کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس
نے باپ کی لاش پر جھکے روتے ہوئے درمحمد کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور جوش غیظ
سے بولا۔

”درمحمد۔۔۔۔۔! میں جانتا ہوں یہ حرکت کس نے کی ہے۔۔۔۔۔ وہ اب میرے
ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ سکے گا۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو در محمد نے جلدی سے کھڑے ہو کر اسے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

”وسان --- ارک جاؤ۔“ وسان کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے۔۔۔ وہ قدرے چونک کر اس کی طرف گھوما۔

”سنگت ---! تیرے سینے میں جو آگ ہے۔۔۔ وہی جوالہ مکھی میرے اندر بھی دک رہا ہے۔ ابھی ٹھہرو۔۔۔ ہمیں جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا آؤ۔۔۔ کیا میرے بابا کو کاندھا بھی نہیں دو گے۔“ در محمد کی آواز شدید غم سے رندھ گئی۔

وسان نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے بعد چاچا فضل کی لاش کی تجھیز و تدفین کی گئی۔ اسے گوٹھ کے قریب ہی بیوی کے ساتھ دفنایا گیا تھا۔ تعزیت کے لیے آئے ہوئے لوگوں میں سے چند معتبر بوڑھوں نے۔۔۔ محمد وسان اور در محمد کو متعلقہ تھانے میں فوراً نامعلوم قاتلوں اور اغوا کنندگان کے خلاف رپورٹ کروانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ قانونی کارروائی پہلے کرنی پڑی۔ اس لیے وہ دونوں مذکورہ چند معتبر لوگوں کے ساتھ متعلقہ تھانے گئے۔ یہ تھانہ۔۔۔ محمد وسان اور در محمد کے گوٹھ کے وسط میں واقع تھا۔ اس تھانے میں ان دونوں گوشوں کے علاوہ چند دیگر گوشوں کی بھی حدود ملتی تھی۔ گویا۔۔۔ تھانہ چودہ میں واقع تھا۔

ایس ایچ او انسپٹر خالق داد اس وقت وہیں موجود تھا۔ وہ ایک گٹھے ہوئے جسم کا پستہ قامت اور توندیل شخص تھا۔ عمر اس کی چالیس پینتالیس کے قریب تھی۔

”ہاں بابا۔۔۔ کیا بات ہے؟“ وہ جھکے دار لہجے میں ان سب کو گھورنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”سائیں۔۔۔! ہمارے گوٹھ دیروگڑھ میں ایک خون اور اغوا کی واردات ہو گئی ہے۔۔۔“ ایک ادھیڑ عمر نے بتایا۔

تو تھانے دار خالق داد یک دم گڑبڑا سا گیا پھر سیدھے ہو کر بیزاری سے بولا

”ارے بابا تو پہلے باہر جا کر ہیڈ محرر کے پاس بیان قلم بند کرواؤ۔۔۔ ایف سی کٹواؤ۔۔۔ پھر اس کے بعد۔۔۔“

”سائیں یہ ہم سب کر چکے ہیں۔۔۔ اور ایف سی کی بجائے ہم ایف آئی آر کٹوانا چاہتے ہیں۔“ محمد وسان تھانے دار خالق داد کے بے اعتنا لہجے پر چڑ کر بولا۔

”ارے چھو کر۔۔۔! تو کون ہے اور تیرا مقتول اور مغوی سے کیا تعلق ہے؟“ تھانے دار خالق داد خشم ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”سائیں۔۔۔! وہ مغویہ میری بیوی تھی۔ نوراں نام ہے اس کا۔۔۔ اور۔۔۔ جو قتل ہوا ہے۔۔۔ وہ میرے دوست در محمد کا باپ تھا۔“ محمد وسان نے اپنے ساتھ کھڑے در محمد کے کاندھے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے جوابا کہا۔

اٹھائے راہ۔۔۔ ہیڈ محرر محمد بجل بھی اندر آ گیا۔ پھر اس نے کیس کی ساری تفصیل اور وسان اور در محمد کے بارے میں تھانے دار کو بتایا تو تھانے دار خالق داد اس سے بولا۔

”ہاؤ بابا ٹھیک ہے پھر۔۔۔ ایف آئی آر کٹواؤ۔۔۔ اور اگر یہ لوگ مجرموں کا بتا رہے ہیں تو ہو درج کر کے فوراً اے ایس آئی لعل محمد کو اٹالی (پولیس پارٹی) سمیت بھیج کر گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔“

”سائیں۔۔۔! وہ تو ٹھیک ہے پر۔۔۔“ محرر محمد بجل کچھ کہتے کہتے رکا پھر وہاں موجود دو سپاہیوں سے بولا۔

”ان سب کو ذرا باہر برآمدے میں بٹھاؤ۔“

محمد وسان کو ایس ایچ او خالق داد کی یہ بات ناگوار لگی تھی۔۔۔ مگر وہ خاموش رہا۔۔۔ اس کے بعد وہ سب ہیڈ محرر محمد بجل کے ساتھ باہر برآمدے میں آ گئے وہاں دیوار سے دو لکڑی کی تختیں اور ایک چوکور سینٹ کے ستون کے قریب میز کرسی دھری پڑی تھی۔ ہیڈ محرر کرسی پر براجمان ہو کر رجسٹر کھولنے لگا۔۔۔ یہ لوگ سب

بچوں پر بیٹھ گئے۔

”ہاں۔۔۔ بابا۔۔۔ مجرموں کے نام بتاؤ۔“ ہیڈ محرم نے اپنے کان میں سے اٹکا ہوا بال پوائنٹ پکڑ کر جڑ کھولتے ہوئے پوچھا۔ تو محمد وسان نے مجرموں کے نام بتاتے ہوئے کہا۔

”لکھو سائیں! ایک تو گہرام اور دوسرا زمیندار دریا خان کا منشی مور یو خان اور باقی اس کے ساتھی۔“

”ایں۔۔۔ ہیڈ محرم نے چونک کر سر اٹھایا اور محمد وسان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا تم نے ان کو یہ واردات کرتے ہوئے دیکھا تھا؟“ اس کے عجیب و غریب سوال پر محمد وسان ذرا ہکا بکا سا رہ گیا مگر اس کے برابر میں بیٹھے اس کے دوست در محمد نے ہیڈ محرم سے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

”سائیں مجرموں کو واردات کرتے ہوئے ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ پولیس بھی تو واردات کے بعد ہی جائے وقوعہ پر پہنچتی ہے۔“ اس کی بات پر ہیڈ محرم بچل نے خشکیں نظروں سے در محمد کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے چھو کر! جانتا نہیں تو اس وقت کہاں بیٹھا ہے؟“ ”اڑے سائیں بجلی صائب! اس میں اتنی گرمی کھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ ایک معتبر شخص صاحب ڈنوں نے ہیڈ محرم سے کہا۔

”جب۔۔۔۔۔ یہ دونوں چھو کرے۔۔۔ ان مجرموں کے بارے بتا رہے ہیں تو آپ پھر لکھو نا ان کے نام تاکہ انہیں فوراً گرفتار کیا جاسکے۔“

”اڑے بابا۔۔۔ میں منشی مور یو خان اور گہرام کے نام کسی چشم دید گواہ یا ثبوت کے بغیر کیسے لکھ سکتا ہوں۔۔۔ کیا مجھ سے زیادہ تم قانون پڑھے ہوئے

ہو۔“ ہیڈ محرم نے اسے گھورا۔

”سائیں۔۔۔ بات قانون پڑھنے یا پڑھوانے کی نہیں ہے۔“ ایک دوسرے معتبر شخص نے اسے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

”ہم آپ کو۔۔۔ مجرموں کا نام بتا رہے ہیں۔۔۔ آپ یہ نام درج کرو۔۔۔ تاکہ ان مجرموں کے خلاف کارروائی آگے بڑھ سکے۔“

”میں یہ نام درج نہیں کر سکتا۔“ بالا خر ہیڈ محرم نے قلم رکھ دیا۔

”کیوں سائیں؟ یہ لوگ وڈیرے کے آدمی ہیں اس لیے۔“

پختہ العر صاحب ڈنوں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ یہ نام درج نہیں کر سکتے تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑ ہوا۔

”ہم شہر کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گئے۔۔۔ چلو بھئی۔۔۔ تم سب نے سن لی ناں۔۔۔ اپنے منشی صاحب کی بات۔۔۔“

اس پر ہیڈ محرم ذرا متذبذب سا ہو گیا۔ پھر بولا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ بیٹھو۔۔۔ میں ذرا صاحب سے مل کر آتا ہوں۔“

وہ یہ کہہ کر کرسی سے اٹھا اور انسپٹر خالق داد صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔ پھر ان سب کی نظریں۔۔۔ انسپٹر خالق داد کے کمرے کے دروازے پر جم جھولتی ہوئی وچ پر جم سی گئیں۔ ذرا دیر بعد ہی ہیڈ محرم دوبارہ نمودار ہوا اور پھر محمد وسان اور در محمد کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم دونوں کو صاحب نے بلوایا ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر صاحب ڈنوں نے اثبات میں دھیرے سے سر ہلایا تو دونوں اس کا اشارہ سمجھ کر انسپٹر کے کمرے کی طرف چل دیے۔

”بیٹھو بابا۔۔۔“

ان کے اندر داخل ہوتے ہی انسپٹر خالق داد نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

دونوں اس کے سامنے دھری کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ انسپٹر خالق داد چند منٹ ان کے چہروں کو گھورتا رہا پھر ہولے سے کھنکار کر کھر درے لہجے میں بولا۔
 ”دیکھو بابا۔۔۔! چونکہ ابھی مجرموں کا صحیح پتہ نہیں لگا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ بلاوجہ زمیندار دریا خان کے آدمیوں سے الجھنے کی بجائے۔۔۔ فی الحال صرف نامعلوم مجرموں کے خلاف رپورٹ درج کروادو۔۔۔ تم بے فکر رہو۔۔۔ اگر مجرم زمیندار دریا خان کے ہی ہیں تو میں انہیں ضرور گرفتار کروں گا۔“

اس کی بات سن کر۔۔۔ محمد وسان اور در محمد کو اپنی کینیٹیوں پر حیرت انگیز سائیں سائیں سی ہوتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر در محمد انسپٹر سے بولا۔

”انسپٹر صاحب۔۔۔! میرا بابا قتل ہوا ہے۔۔۔ اور میرے دوست مہمان کی بیوی اغوا ہو چکی ہے۔۔۔ ہم اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔۔۔ اگر آپ۔۔۔ زمیندار دریا خان سے اس قدر خوف زدہ ہیں تو کوئی بات نہیں۔۔۔ ہم آپ کو تکلیف نہیں دیتے۔ شہر جا کر قانون سے انصاف مانگیں گے۔“
 یہ کہہ کر در محمد نے محمد وسان سے کہا۔ ”چلو سنگت۔۔۔ لگتا ہے یہاں کے مجرم پولیس سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔“

استہزائیہ انداز میں کہے ہوئے اس جملے نے۔۔۔ انسپٹر خالق داد کو سلگا دیا۔

”ٹھیک ہے پھر۔۔۔ جوانی کا جوش ہے ناں۔۔۔ اتر جائے گا۔۔۔ یہ جوش بھی۔“ انسپٹر خالق داد نے سننا تے لہجے میں کہا۔

”جاؤ پھر۔۔۔ محر کو نام لکھو دادان مجرموں کے۔“
 محمد وسان اور در محمد تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہیڈ محر بھی غور سے ان کا چہرہ نکتے لگا۔ جیسے یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو کہ آیا اس کے

’صاحب‘ کی بات ان دونوں چھو کروں نے مان لی تھی یا نہیں۔

”نشی صاحب۔۔۔! آپ مجرموں کے نام لکھو۔۔۔ نشی۔۔۔ مور یو خان

اور گہرام ولد رکھیو۔“ در محمد نے سپاٹ لہجے میں ہیڈ محر سے کہا۔

ہیڈ محر ایک بار پھر انسپٹر کے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔

در محمد نے صاحب ڈنو اور دیگر ہمدردوں کو بتایا کہ اس بدنیت انسپٹر کی کیا مرضی ہے۔

ذرا دیر بعد ہیڈ محر دوبارہ آ گیا اور ان دونوں کی طرف گھورتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

مجرموں کے مذکورہ نام لکھے اس کے بعد سب کو چلتا کر دیا۔ محمد وسان اور در محمد دوسری پریشانی میں گھر گئے تھے۔ پولیس کی کارکردگی سے جو بالکل ہی مایوس کن تھی۔ تعزیت کرنے والے لوگ رفتہ رفتہ لوٹ رہے تھے۔ فقط صاحب ڈنو اور دیگر قریبی ہمدرد وہیں بیٹھے رہے تھے۔ انہیں بھی انسپٹر خالق داد سے مجرموں کے خلاف کسی قسم کی خاطر خواہ کارروائی کی امید تو نہیں تھی۔

”دیکھتے ہیں۔۔۔ پولیس کیا کرتی ہے۔ ورنہ۔۔۔ یا تو شہر جانا ہو گا۔۔۔ یا پھر۔۔۔ وڈے سائیں بھوتا سردار۔۔۔ حاجی پیارو خان کے ہاں فریاد کریں گے۔“ صاحب ڈنو نے مشورہ دیا۔

محمد وسان اور در محمد کے چہرے غم و غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔

”میرا خیال ہے۔۔۔ مغرب کے بعد ہمیں دوبارہ تھانے جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔“

ایک دوسرے ہمدرد نے رائے دی اس کا نام دودا تھا اور وہ صاحب ڈنو کا ہم عمر تھا۔۔۔ سب نے اس کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے سر ہلا دیے۔

مغرب کی نماز قریبی مسجد میں باجماعت پڑھنے کے بعد۔۔۔ یہ لوگ

”پولیس الٹا ظالموں کو تحفظ ہی دے گی۔ مظلوموں کو انصاف نہیں۔“ محمد
وسان دل کی بھڑاس لفظوں کی صورت میں نکال رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سنگت۔۔۔! میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ دشمنوں نے
میرے باپ کو قتل اور میری بھاجائی (بھابھی) نورائیں کو میرے گھر سے اٹھا کر اچھا نہیں
کیا۔ جب تک بھاجائی کو چھڑا نہ لیں مجھ پر چین و سکون حرام ہے۔“

بالآخر درمحمد نے بھی اس کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہا اور اس کے بعد دونوں
دوست سر بہ سر انتقام بنے ہوئے اپنی کلباڑیاں سنبھالے رات کی تاریکی میں نکل
پڑے۔

☆.....☆.....☆

نورائیں خوف اور صدمے کے باعث بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کی جب
دوبارہ آنکھ کھلی تو خود کو ایک پرانے گودام نما کمرے میں پایا۔ جہاں اناج کی بوریوں
کے علاوہ چند رنگ آلود زرعی آلات بکھرے ہوئے تھے۔ نورائیں ایک جھنگلاسی کھری
چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دماغ میں
ثولیدہ خیالات کی یلغار ہونے لگی اسے دھیرے دھیرے سب یاد آنے لگا کہ گہرام
اور اس کے ساتھی چاچا فضل کو بے دردی سے قتل کرنے کے بعد اسے اغواء کر کے لے
آئے تھے۔

اس کا متوحش دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے شوہر محمد وسان کے
بارے میں سوچا کہ اس کی غم و غصے کے مارے کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ اس نے متوحش
نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں صرف بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ وہاں سے
سورج کی کرنیں اندر آرہی تھیں۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے کھولنے کی کوشش
کی وہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازے کی دوسری طرف چند قدموں
کی آہٹ ابھری۔ نورائیں یک دم۔۔۔ دہشت زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور

تھانے پہنچے تو وہاں سناٹے کا راج تھا۔
حوالات میں چند قیدی سیلن زدہ اور اکھڑے ہوئے پستر کے نیچے فرش پر
پڑے خراٹے لے رہے تھے۔
دوسپاہی۔۔۔ ایک بیچ پراونگھتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں جگا کر پوچھا گیا تو
وہ بولے۔

”ابھی تک کسی کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ کیوں کہ۔۔۔ انسپٹر
صاحب کو اچانک آپریشن کے سلسلے میں بھاری جمعیت کے ساتھ جانا پڑ گیا تھا۔“
ان لوگوں کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر مجبور تھے۔ کچھ بولتے تو الٹی آنتیں گلے
پڑنے کا ڈر تھا۔ چنانچہ وہ لوگ واپس گھروں کو لوٹ آئے۔

درمحمد اور محمد وسان بھی گھر آ گئے۔
پورا گھر بھائیں۔۔۔ بھائیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ محمد وسان کی دلی کیفیت
زیادہ ابتر تھی اسے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی
تھیں۔ پولیس کی چشم پوشی اور بے اعتنائی نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ اس کی جلتی سلگتی
آنکھوں کے سامنے بار بار اپنی معصوم اور نوبہا ہتایوی نورائیں کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ جو
بار بار اپنی مٹھیاں کھول بھینچ رہا تھا۔۔۔

جانے نورائیں بے چاری کس حال میں ہوگی؟ جیسے جیسے سے بیتا جا رہا تھا
وسان کے دل و دماغ میں بھیانک اندیشوں اور وسوسوں کے سانپ اسے متواتر
ڈسے جا رہے تھے۔ پھر جب غصے اور انتقام کی آگ ناقابل برداشت ہو گئی تو۔۔۔ محمد
وسان یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور جوش و غیظ سے مغلوب ہو کر کپکپاتے لہجے میں کہا۔
”درمحمد۔۔۔! ہمیں انصاف خود ہی لینا ہوگا۔“

درمحمد کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ آخر کو ظالموں نے اس کے بے
گناہ باپ کو بے دردی سے قتل کر ڈالا تھا۔

”چلو پھر۔۔۔ اس طرف۔“ درمحمد نے سرگوشی کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ۔۔۔ حویلی کے عقبی احاطے کے بڑے سے چوہی گیٹ کے دم بہ خود ہیولوں کی طرح کھڑے تھے۔ حویلی کے گرد۔۔۔ چھ فٹ گارے مٹی کی دیوار تھی۔ جس کا رقبہ خاصا وسیع تھا۔ اوطاق احاطے کی اندرونی طرف واقع تھا۔ دروازہ البتہ بند تھا۔ یہاں کوئی پہرے دار یا ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔

”سگت۔۔۔۔! تو مجھے کاندھا دے۔۔۔ میں پہلے اندر کودوں گا۔“ درمحمد بولا۔

”نہیں۔۔۔ میں تجھے اکیلا اندر نہیں جانے دوں گا۔ میں بھی جاؤں گا تیرے ساتھ۔“ محمد وسان نے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”چلو پھر۔۔۔۔ دروازہ ٹاپنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ درمحمد نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے رضا مندی سے کہا۔ پھر دونوں نے اپنی اپنی کلباڑیاں پشت پر اٹکائیں اور گیٹ کے چوہی دروازے کے ابھرواں رخنوں سے اوپر چڑھنے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد وہ اندر کود چکے تھے۔

وہ دونوں پھلواہی کی ایک طویل باڑ کے عقب میں چند ٹاپے دہک کر سامنے مدھم روشنی میں گھورنے لگے۔ یہاں مکمل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ حویلی کی عقبی بلند دیوار بالکل سپاٹ تھی۔ ذرا بلندی پر درختے بھی بند تھے۔ بائیں جانب انہیں اوطاق کا دروازہ نظر آیا۔ سامنے سرکنڈوں کا چھپر نما سائبان تھا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے محتاط روی سے آگے بڑھنے لگے۔ دونوں نے اپنی کلباڑیاں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ جوش اور غیظ سے بھرے دل و دماغ کے ساتھ وہ بے دھڑک اوطاق کے بند دروازے کے قریب پہنچے تو انہیں اوطاق کے اندر کسی کے زور زور سے آتے ہوئے خراٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کے

چہرے کی طرف دیکھا پھر نظروں ہی نظروں میں خاموش پیغام کے تبادلے ہوئے اور۔۔۔ محمد وسان نے بے آواز آگے بڑھ کر۔۔۔۔۔ اوطاق کے دروازے کو پورا اندر کی طرف دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہلکے پادور کا بلب روشن تھا۔ دونوں غراپ سے اندر آ گئے۔ سامنے چار پائی پرانہوں نے کسی کو سوتا پایا۔ اس اکیلے سوتے ہوئے شخص کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ محمد وسان نے دانت میچتے ہوئے اپنی کلباڑی کے ٹھوکے سے اس سوتے ہوئے کو جگایا۔ تو وہ۔۔۔۔۔ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا درمحمد نے فوراً اس کی گردن دبوچ کر اور انکارہ آنکھوں سے اسے گھورا اور بولا۔۔۔۔۔

”خبردار۔۔۔! کوئی آواز نکلی تو۔۔۔۔۔ ورنہ کلباڑیاں مار کر تیرے ٹوٹے کر دیں گے۔“ درمحمد کی دھمکی نے اسے خاموش رہنے کی پر مجبور کر دیا۔

”گہرام کدھر ہے۔“ وسان نے درستی سے پوچھا۔

”مم۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم؟“ وہ ہکلا کر بولا۔

”بتاتا ہے یا اٹھاؤں کلباڑی۔۔۔۔“ درمحمد نے اس کی گردن چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے کلباڑی بلند کر لی۔

”بول۔۔۔۔۔ ورنہ ابھی تجھے خون میں نہلا دوں گا۔“

اس کی خوف ناک دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ لگت زدہ لہجے میں کھٹکھٹایا اور بولا۔

”گہرا۔۔۔ گہرام اپنے ہی گھر میں ہو گا۔“ درمحمد نے وسان کی طرف دیکھا وہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔

”میں نے دیکھا ہے اس کا گھر۔“

پھر زمیندار دریا خان کے حواری سے بولا۔

”تجھے پتا ہو گا۔ وہ کمینہ ایک لڑکی کو قریبی گوٹھ سے اٹھا کر لایا ہے۔۔۔۔۔ اسے

کدھر رکھا ہے؟“

”میں۔۔۔ مجھے بالکل پتا نہیں۔۔۔ گہرام کو ہی پتا ہوگا۔“ جیسے اپنی جان چھڑاتے ہوئے بولا۔

”سنگت۔۔۔! میرا خیال ہے ہمیں اس حرام زادے گہرام کو پکڑنا چاہیے وہی ہمارا اصل دشمن ہے۔“

”ہاں۔۔۔ چلو۔“ اس کے بعد حواری کو دھمکا کر دوبارہ چادر اوڑھ کر خاموشی سے سوتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے دونوں یار اوطاق سے باہر نکلے تو۔۔۔ باہر سے دروازہ بند کر کے وہ تاریک میں گم ہو گئے۔ گہرام کا گھر۔۔۔ حویلی سے زیادہ دور نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

پختہ اینٹوں والے اس نسبتاً بڑے سے مکان پر تاریکی اور سنائے کا غلبہ تھا۔ روشن آسمان پر جانے کہاں سے بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں نے یلغار کر دی تھی۔ اندر کشادہ صحن ویران تھا۔ معاصحن کی دیوار پر ایک ہیولہ نمودار ہوا۔ جس کی پشت سے کلباڑی کا پھل جھانک رہا تھا۔ اس ہیولے نے جو تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ بہ غور اندر کا جائزہ لیا۔ مختصر سے برآمدے پر بلب روشن تھا۔ جس کی کمزور برقان زدہ سی روشنی میں اس پر اسرار ہیولے نے برآمدے سے نظر آنے والے دو کمروں کے دروازے پر نظر ڈالی۔ جو بند تھے۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کے سہارے سے ایک دوسرے اپنے جیسے ہی کلباڑی بردار کو اوپر دیوار پر کھینچا۔

یہ دونوں۔۔۔ محمد و سان اور در محمد تھے جو اس وقت گہرام کے مکان کی دیوار پر موت کے بھیاں سائے کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دونوں اندر کود گئے۔

اندر صحن میں کودتے ہی دونوں چند لمحوں میں اپنی جگہ دم سادے گرد و پیش کی سن گن لیتے رہے۔ پھر بیک وقت پھواری کی اوٹ سے نکل کر۔۔۔ محتاط رو سے

برآمدے کی طرف بڑھے۔ کمروں کے دونوں دروازے بند تھے۔ یقیناً ان دونوں میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود تھا۔ اچانک دونوں برآمدے کی طرف بڑھتے بڑھتے ٹھنک کر رکے۔ دونوں نے اگرچہ اجرک کے چہروں پر ڈھالے باندھ رکھے تھے۔ مگر انہیں اپنے پہچانے جانے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ اچانک کھلا تھا۔ سامنے ایک کچی عمر کی عورت جماہیاں لیتی ہوئی نمودار ہوئی۔ وہ شاید اپنے ہی خیال سے کسی ضرورت کے تحت باہر نکلی تھی۔ مگر سامنے ان دونوں کلباڑی بدست و سان اور در محمد کو دیکھ کر وہ پہلے تو سنائے میں آ گئی۔ پھر زوردار ہڈیانی چیخ مار کر واپس پلٹی اور دروازہ بند کرنے لگی۔ وسان اور در محمد دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ عورت دہشت زدہ ہو کر چار پائی پر ڈھسے گئی (بے ہوش ہو گئی) برابر کی چار پائی پر سویا ہوا ایک شخص عورت کی چیخ سن کر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا تو۔۔۔ وسان نے اسے دبوچ لیا یہ گہرام تھا۔

”خبردار کتے! اگر کوئی آواز نکالی تو۔۔۔ بول نوراں کدھر ہے۔ ورنہ تجھے خون میں نہلا دیں گے۔“

وسان نے زہرناک لہجے میں اسے شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور گہرام جیسے اپنے مخاطب کو پہچان کر مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

”تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں داخل ہونے کی۔۔۔ میں۔۔۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ در محمد نے اپنی کلباڑی کا ٹکڑا اس کی پیشانی پر مارا گہرام کے خلق سے تکلیف کے مارے کراہ آمیز چیخ نکال گئی۔

”کینے۔۔۔ کتے۔۔۔! میرے باپ کا قتل کر کے اکڑ رہا ہے۔ بول بھاجائی (بھابھی) نوراں کو تو نے کدھر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ اس بار کلباڑی مار کر تیرا سر پھاڑ دوں گا۔“

در محمد کے وحشت خوں رنگ لہجے نے گہرام پر دہشت طاری کر دی۔ اس کی

”نوراں۔۔۔! ہمت سے کام لو۔۔۔ اللہ پر بھروسہ کرو۔“ وسان نے اسے تسلی دی۔ معاہدہ سے گہرام کی درشت آواز ابھری۔

”وسان۔۔۔! دروازہ کھول کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔۔۔ ورنہ تم دونوں کا انجام بھی۔۔۔ تمہارے دوست درمحمد جیسا ہوگا۔“

وسان کے اندر آتش فشاں ابلنے لگا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ۔۔۔ اس کے مسلح ساتھی کسی وقت بھی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ یوں منہ چھپائے بیٹھے رہنے سے خطرہ مزید گلے پڑ سکتا ہے چنانچہ۔۔۔ وسان نے ایک انتہائی خطرناک چال چلنے کا سوچا اور پھر نوراں کو ایک طرف کر کے دروازہ کی طرف اپنا منہ لے جا کر بولا۔

”گہرام! میں دروازہ کھول رہا ہوں۔۔۔ مگر ہماری زندگیوں کی کیا ضمانت ہے؟“

یہ اس نے دانستہ کہا تھا۔ ورنہ تو وہ سمجھ چکا تھا کہ۔۔۔ وہ اس وقت ویسے ہی گہرام اور اس کے تینوں خواںخوار ساتھیوں کے رحم و کرم پر تھا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔۔۔ پہلے دروازہ کھولو۔۔۔“

گہرام کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری اور وسان نے بالآخر۔۔۔ اپنے منصوبے کے مطابق دروازے کی کنڈی ہٹا دی۔۔۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔۔۔ طاقت کے رعوت آمیز جوش میں جیسے ہی گہرام کا ایک ساتھی رائفیل سنبھالے دروازے پر نمودار ہوا۔ وسان نے پھرتی کے ساتھ اس کی رائفیل کی نال پر جھپٹا مارا دوسرے ہی لمحے رائفیل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہیں رائفیل لٹھ کی طرح گھما کر اس کے سر پر ماری۔ دشمن کے حلق سے کریہہ چیخ نکلی اور اس کا سر کھل گیا بھل بھل خون اس کے پھٹے ہوئے سر سے بہنے لگا۔ باہر موجود اس کے باقی دو مسلح ساتھیوں نے بری طرح ٹھنک کر فائر کھول دیے۔ وسان یک دم دیوار سے چپک گیا مضروب دشمن کئے ہوئے شہیر کی طرح زمین بوس ہو چکا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا

تھا۔ وسان نے رائفیل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ڈری سبھی نوراں کو اس نے دیوار کے سہارے خود سے ذرا دور کھڑا کر دیا تھا۔ گولیوں کی خون ناک بو چھاڑ سے دروازہ اکھڑ کر گر چکا تھا اور نگلی چوکھٹ کے دوسری طرف۔۔۔ گہرام اور اس کے باقی دونوں ساتھی موت بنے کھڑے تھے۔ وسان دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش مثل لاوے کے سلگ رہی تھی۔

پھر اس کی ٹھنکی ہوئی سماعت نے سنا۔

”یارو۔۔۔ تو چھت پر جا۔۔۔ اور روشن دان سے ان دونوں کا نشانہ لے کر مار ڈال انہیں۔۔۔ جا بابا کٹرا (جلدی) یہ گہرام کی آواز تھی۔ وسان نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا۔ وہ خاصی بلندی پر بالکل چھت کے ساتھ تھا۔ یارو نامی گہرام کا ساتھی وہاں پہنچ کر با آسانی ان دونوں کو وہیں سے ہی گولیوں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔

مگر۔۔۔ وسان اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہ دونوں موت کے سفاک دہانے پر کھڑے تھے۔ صرف انہیں جھپٹنے کو بے چین تھے۔ اٹائے راہ۔۔۔ گہرام کی دوبارہ آواز ابھری وہ اپنے دوسرے ساتھی کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

”اڑے میرل! اپنی رائفیل مجھے دے۔ تو اوطاق کی طرف دوڑ جا۔۔۔ اور اپنے ساتھیوں کو لے آ۔۔۔ بھاگ۔۔۔“

وسان کا دل سائیں۔۔۔ سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ بے چین ہو گیا گہرام کے ساتھیوں کے یہاں آنے کا مطلب اس کی اور نوراں کی یقینی موت تھا۔ جو کچھ کرنا تھا ابھی کرنا تھا۔ وسان نے بے موت مرنے کی بجائے جنگ کر کے مرنے کو ترجیح دی اور۔۔۔ اور۔۔۔ پھر اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ اس نے ایک نگاہ قریب دیوار سے چپکی کھڑی متوحش نوراں کی طرف دیکھا پھر۔۔۔ اپنی رائفیل کو سیدھا کیا اور جڑے بھینچ کر وہ نگلی چوکھٹ کے سامنے آ گیا اور لیلی دبادی

گولیوں کی بوچھاڑ اُمڈی۔۔۔ گہرام اسے دیکھتے ہی ایک طرف کو جست لگا چکا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی جو واپس جانے کے لیے مڑ چکا تھا۔ اس کی گولیوں کی زد میں آ گیا اور چیخ مارتے ہوئے گر پڑا۔ وسان نے گہرام کا نشانہ لیا۔ جو بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے نوران کی ہڈیانی چیخ سنائی دی۔

”وسان۔۔۔!“ وہ۔۔۔۔۔ سراپا آتش فشاں بنا پلٹا تو اندر سامنے کی دیوار پر اسے ایک ہیولا دکھائی دیا۔ جس کا نصف دھڑ چھت پر تھا اور چکاوڑ کی طرح۔۔۔ الٹا جھول کر۔۔۔ روشن دان سے اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف کیے ہوئے تھا۔ وسان نے اسے فائر کا موقع دیے بغیر وہیں سے اس کا نشانہ لے کر لیبی بادی اس کی رائفل نے ایک طاقت ور برسٹ اگلا اور روشن دان کے باہر اٹنے لگے یاروٹائی گہرام کے دوسرے ساتھی کے حلق سے ایک چیخ خارج ہوئی اور وہ نیچے آ رہا۔

”نوران۔۔۔!“ ادھر آ۔۔۔۔۔ وسان نے نوران کو آواز دی۔ وہ لرزتی کانپتی اس کی طرف بڑھی۔

وسان نے ایک ہاتھ سے رائفل سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے نوران کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ اس نے متلاشی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ گہرام شاید بھاگ چکا تھا۔ وسان نے عمارت کے چاروں طرف طواف کر کے اطمینان کر لیا تھا مگر اسے اپنے اصلی دشمن گہرام کے فرار ہونے پر از حد افسوس ہوا۔ اس نے ایک غم زدہ سی نظر اپنے دوست در محمد کی لاش پر ڈالی۔ پھر۔۔۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”سنگت۔۔۔ تو نے دوست کی خاطر اپنی جان دے دی۔۔۔ مگر میں نے تیرے اور تیرے باپ کے دشمنوں کو زندہ نہیں چھوڑا۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے نوران کا ہاتھ پکڑا اور دونوں تاریکی کی آغوش میں گم ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

محمد وسان اپنی بیوی نوران کو لے کر اپنے مرحوم دوست در محمد کے گھر پہنچا۔

نوران بری طرح خوف زدہ تھی اور سر اسیمہ لہجے میں وسان سے بولی۔

”دس۔۔۔ سائیں! ہمیں۔۔۔ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔ کہ۔۔۔ کہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ لوگ ادھر نہ آ جائیں۔

”وہ حرام زادہ گہرام اب دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“ وسان غصے سے دانت بھینچ کر بولا۔

”ذرا صبح ہو لینے دو۔۔۔ میں گوٹھ کے چند لوگوں کے ساتھ۔۔۔ تھانے جا کر۔۔۔ تمہارا بیان قلم بند کروادوں گا۔۔۔ تاکہ اس بزدل انسپکٹر خالق داد کو بھی حقیقت کا علم ہو سکے۔“ بے چاری نوران شوہر کے آگے کچھ نہ بول سکی۔ محمد وسان کا ارادہ۔۔۔ صاحب ڈنوا اور اپنے دیگر ہمدردوں کے ساتھ تھانے جانے کا تھا۔

سپیدہ سحر نمودار ہوا تو۔۔۔ گوٹھ کی زندگی دھیرے دھیرے بیدار ہونا شروع ہوئی۔ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ نیند، سکون اور آرام۔۔۔ جیسے ان دونوں سے چھن چکا تھا۔ وسان نے صاحب ڈنوسمیت دیگر خیر خواہوں کو اکٹھا کیا اور انہیں ساری رو داد بتائی۔۔۔۔۔ وہ سب پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ۔۔۔ تھانے کی طرف چل دیے۔ ویران اور کچے دھول اڑاتے راستے پر انہیں ایک بغیر ہڈ کی چیپ آتی نظر آئی۔ وہ سب بری طرح ٹھک گئے۔ وسان نے فوراً خطرے کی بومحسوس کی اس نے نوران کا ہاتھ پکڑا۔ دائیں جانب ڈھینگروں کا ڈھیر تھا وہ اسے کھینچتا ہوا۔۔۔ ڈھینگروں میں جا گھسا۔ اوٹ سے دیکھا تو۔۔۔۔۔ چیپ قریب آ کر رک چکی تھی۔ چیپ سے چار مسلح افراد کدرا کڑے مار کر اترے۔ وسان ان میں سے گہرام کو پہچان کر پریشان سا ہو گیا۔ اگرچہ اپنے بدترین دشمن گہرام کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا مگر۔۔۔ وسان جانتا تھا کہ یہ وقت جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کا تھا۔ وسان کے ہمدردوں کی تعداد۔۔۔ صاحب ڈنوسمیت پانچ تھی۔ وہ وسان اور نوران کے اچانک غائب ہونے پر ذرا نہیں چونکے تھے اور ایک دم انجان بن کر

گہرام اور اس کے تین مسلح آدمیوں کے چہرے دیکھنے لگے۔

”دونوں کدھر گئے تھے۔ ابھی تو تمہارے ساتھ تھے۔“ معا گہرام نے درشت لہجے میں صاحب ڈنو سے پوچھا اور۔۔۔ شکرے جیسی نظروں سے ڈھینگروں کی طرف دیکھنے لگا۔ وسان کو دھڑکا ہوا۔۔۔

”ہمیں نہیں معلوم۔۔۔ تم کن دو افراد کی بات کر رہے ہو؟“

صاحب ڈنو نے مرعوب ہوئے بغیر انجان بن رک گہرام سے کہا۔

”او بڈھے۔۔۔ ازیا دہ چالاک بننے کی کوشش مت کر۔“ گہرام دھاڑا پھر باری باری ان سب کو گھورتے ہوئے دھمکی آمیز غراہٹ سے بولا۔

”تم لوگوں نے مل کر میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کرنے کی جرات کیسے کی۔۔۔ شرافت سے بتا دو۔۔۔ ان دونوں کو کدھر غائب کیا ہے۔۔۔ تم لوگوں نے۔۔۔؟“

”اڑے چھو کر۔۔۔ تمیز سے بات کرو۔“ ایک دوسرا خیر خواہ گہرام سے برہم ہو کر بولا۔

”ظلم کی رات تھوڑی ہوتی ہے۔ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔“ اس کی سرزنش پر گہرام آپے سے باہر ہو گیا۔

تب اس نے اپنے تینوں ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”ان لوگوں کو یہاں سے ہلنے نہ دینا۔۔۔ میں ان ڈھینگروں کے پاس جا کر دیکھتا ہوں۔ میں نے ان دونوں کو یہاں چھپتے ہوئے دیکھا تھا۔

اب تو وسان کو تشویش لاحق ہونے لگی۔ ڈھینگروں کا یہ سلسلہ انتہائی مختصر تھا صاحب ڈنو اور دیگر خیر خواہ بھی گہرام کی بات پر پریشان اور بے چین سے نظر آنے لگے۔ گہرام کے تینوں خونخوار ساتھیوں نے اپنی گنوں کا رخ ان کی طرف کر کے گویا انہیں اپنی جگہ ساکت و جامد رہنے پر مجبور کر دیا۔ گہرام اپنی گن سنبھالے شکاری

کتے کی طرح وسان اور نوراں کی بوسو نکھتا ہوا۔۔۔ ڈھینگروں کی طرف بڑھنے لگا وسان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے نوراں کو بالکل ساکت و خاموش دیکھ رہنے کی سرگوشیانہ تاکید کی۔ پھر جیسے ہی گہرام۔۔۔ ذرا قریب آیا۔۔۔ وسان یک دم قیامت بن کر اس پر ٹوٹا۔ اس نے اچانک ڈھینگروں سے ابھر کر۔۔۔ گہرام کی رائفل کو دونوں ہاتھوں سے نال کی طرف سے پکڑا اور اس کی مدد سے اس کے سینے پر رائفل کا دستہ مارا۔ گہرام اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اس کے ساتھی بری طرح ٹھٹھکے مگر ابھی شاید یا تو کچھ سمجھ نہیں پائے تھے یا پھر فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ لیکن ادھر وسان نے گہرام کی چیخنی ہوئی رائفل اس کی کٹپٹی سے لگا دی۔۔۔ اور غرا کر بولا۔

”اپنے کتوں سے بولو ہتھیار پھینک دیں ورنہ تیرا بھیجاڑا دوں گا۔“ وسان کے لہجے کی آتشیں پیش کو محسوس کر کے گہرام نے چلا کر اپنے تینوں ساتھیوں کو ہتھیار پھینک دینے کو کہا۔ باقی لوگ دم بہ خود کھڑے رہ گئے تھے۔ وسان نے نوراں کو جیب کے پاس جانے کو کہا اور پھر خود۔۔۔ گہرام کو رائفل کی زد پر لیے۔۔۔ جیب کے قریب آیا۔

پھر اسے جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ گہرام دانت کچکاچکا ہوا جیب میں سوار ہوا۔ وسان نے تینوں کی رائفلوں پر قریب کھڑے اپنے خیر خواہوں کو قبضہ جمانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی انہیں بھی جیب میں سوار ہونے کو کہا۔

پھر وسان اور نوراں بھی سکٹر سمت کر بیٹھ گئے۔ وسان نے رائفل کی نال گہرام کی گردن پر ٹکا کر اسے تھانے چلنے کا درشت حکم دیا۔ گہرام نے جیب اشارت کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ ذرا دیر بعد وہ لوگ تھانے میں تھے۔ انسپٹر خالق اور ہیڈ محرو ہیں موجود تھے۔ گہرام کو دیکھ کر انسپٹر خالق داد بری طرح چونک گیا۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ البتہ گہرام کے خبیث چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ رقصاں

”بلکہ۔۔۔ تم سب کو خوش ہونا چاہیے کہ۔۔۔“

”اڑے چھو کرا۔۔۔ تو کس دنیا میں رہ رہا ہے۔۔۔ پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ الٹا اب ہم پر قیامت ٹوٹنے والے ہے۔“ مٹھل نے اس کی بات کاٹ کر روہانے لہجے میں کہا۔

اس کے لرزیدہ لہجے میں گویا برسوں کا تجربہ پہتاں تھا۔ وسان گوگو کھڑا تھا احمد بخش وسان کی منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھ پٹ۔۔۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ چلا جا۔۔۔ نوراں کو لے کر۔۔۔ سائیں پیارو خان کے پاس چلا جا۔۔۔ کہیں بھی چلا جا۔۔۔ اپنی اور نوراں کی زندگی کا خیال کر۔۔۔“

وسان بری طرح جھنجھلا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کے ماں باپ اور سر کو ایسا کون سا خوف کھائے ہوئے تھا۔ وسان نے اٹل لہجے میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ یہ دھمکی بھی دے ڈالی۔

”کہ۔۔۔ اگر۔۔۔ تم لوگ ہم سے اتنے ہی بیزار ہو گئے ہو تو ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ مگر اس گوٹھ سے اب کسی صورت بھی نہیں نکلیں گے۔“

وسان کے لہجے کی غیرت آمیز حمیت نے دونوں بوڑھوں کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ بہ ظاہر یہ سب کچھ ٹھیک تھا۔۔۔ مگر اس ”ٹھیک“ کے پیچھے ایک نا دیدہ طوفان کر دیش لے رہا تھا جس کا وسان کو نہیں تو مٹھل اور احمد بخش کو ضرور علم تھا۔۔۔ دونوں بھائیوں نے ایک روز سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ۔۔۔ وہ سب لوگ یہ گوٹھ چھوڑ کر وڈیرے پیارو خان کی جاگیر کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔۔۔ جب انہوں نے اپنا یہ عندیہ وسان کے سامنے پیش کیا تو وسان تھوڑی دیر پر سوچ خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔ درحقیقت اس کا بھی اب اس جبر و استبداد کی دھرتی سے دل میلا ہو گیا تھا۔ وہ یہاں سے ہجرت کرنے پر راضی تو تھا مگر۔۔۔ کسی دوسرے گوٹھ کی بجائے

تھی۔ گویا وہ تھانہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ بلکہ محفوظ پناہ گاہ میں آ گیا ہوں۔

وسان اور اس کے خیر خواہ صاحب ڈنو وغیرہ نے انسپٹر خالق داد کو ساری روداد بیان کر دی اور ساتھ ہی نوراں کا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا۔ ضابطے کی کارروائی نمٹانے کے بعد انسپٹر خالق داد نے وہاں موجود سپاہیوں سے انہیں لاک اپ کرنے؛ حکم دیا۔ اس کے بعد یہ لوگ گھر واپس آ گئے۔ گہرام کی گرفتاری کے بعد محمد وسان خود کو بالکل ہلکا پھلکا سمجھنے لگا۔ وہ نوراں کو دیکھ کر فکر مند ہو گئے اور جب وسان نے اپنے باپ مٹھل اور چاچا (سر) احمد بخش کو گہرام کی گرفتاری کا بتایا تو خلاف توقع وہ لوگ اور بھی پریشان ہو گئے۔ وسان اچنبھا ہوا۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔۔۔ پٹ وسان۔۔۔! یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔۔۔“ اس کا بوڑھا باپ ہاری مٹھل از حد پریشانی سے بولا۔ اس کی بوڑھی اور جہاندیدہ آنکھوں میں ایسا ایک بے نام سی سراسیمگی اور تشویش اتر آئی۔

وسان نے حیرت سے کہا۔ ”بابا۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔۔۔ اس حرام زادے گہرام نے میرے دوست در محمد اور اس کے بوڑھے باپ کا خون کیا۔ میری بیوی نوراں کو اغوا کر کے اس پر اپنے بھائی پھکو موالی سے زبردستی شادی کے لیے دباؤ ڈالا۔۔۔ اور۔۔۔ اور میں نے اس ذلیل گہرام کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے تو۔۔۔ میں نے اچھا نہیں کیا؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تو نے اچھا نہیں کیا وسان۔۔۔! اچھا نہیں کیا، تیری اس بہادری کی سزا اب ہم سب کو ہی بھگتنا پڑے گی۔“ اس بار اس کے سر یعنی نوراں کے بوڑھے باپ احمد بخش نے انتہائی تشویش آمیز ٹولیدگی سے کہا۔ مگر وسان نے دانت بھیج کر اٹل لہجے میں کہا۔

”میں نے جو ٹھیک کیا ہے۔۔۔ یہ شکر کرو۔۔۔ کہ اس حرام زادے کا خون نہیں کیا۔۔۔ اور اسے پولیس کے حوالے کر آیا۔ وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔۔۔ بلکہ

وہ۔۔۔ شہر ہی جا کر رہنے کو ترجیح دینا چاہتا تھا۔ اس کی بات پر مٹھل بولا۔
 ”اڑے پٹ۔۔۔ ہمیں تو دھاک کی (کھیت مزدوری) کے سوا اور کچھ نہیں
 آتا شہر جا کر کیا کریں گے؟“

”بابا۔۔۔ کر لیں گے کچھ نہ کچھ۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا تم لوگ
 کیوں پریشان ہوتے ہو۔۔۔ وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی مزدوری کا کام مل ہی جائے
 گا۔“

بالآخر دونوں بوڑھوں نے۔۔۔ وسان کی بات پر صا د کیا۔

☆.....☆.....☆

یہ گہرام کو گرفتار ہوئے دوسرا دن تھا۔ انہوں نے نیل گاڑیاں تیار کیں اور شہر
 روانہ ہونے کے لیے انہوں نے علی الصباح کا انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ صبح ان لوگوں نے
 اپنی نیل گاڑیوں میں ضروری سامان رکھا۔۔۔ جو چند بوسیدہ لہجیوں اور ٹوٹے پھوٹے
 کنستروں جیسے ٹرکوں پر مشتمل تھا۔ جب یہ روانہ ہونے لگے تو اچانک وسان کو ایک
 شخص تیز تیز قدموں سے ان کی طرف آتا دکھائی دیا پھر دوسرے ہی لمحے اسے پہچان
 کر بری طرح ٹھنک گیا۔ اس کا ہمدرد۔۔۔ صاحب ڈنوتا۔

اس نے قریب آتے ہی پہلے تو حیران کن نظروں سے بھری پری نیل
 گاڑیوں کو دیکھا پھر جیسے ساری بات اسے سمجھ میں آگئی اور تب اس نے وسان کو ایک
 چونکا دینے والی اطلاع دی کہ رذیل صفت گہرام تھانے سے رہا ہو گیا ہے۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیسے ہوا؟“ وسان نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔
 ”وڈیرے دریا خان نے اپنی ضمانت پر اسے رہا کر دیا ہے۔“ صاحب ڈنوتا
 نے جواب دیا۔

وسان کے ساتھ۔۔۔ اس کا باپ مٹھل اور سرچاچے احمد بخش کے چہروں
 پر بھی گہری تشویش آمیز تفکیر پھیل گئی۔ تاہم صاحب ڈنوتا نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا

کہ ان کا گوٹھ چھوڑنے کا فیصلہ درست ہے۔ وسان کی آنکھوں میں خون اتر آیا
 تھا۔ گہرام اس کا مجرم تھا۔ وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اپنی بے عزتی کا بھی اور
 اپنے وفادار دوست در محمد اور اس کے بوڑھے باپ کے قتل کا بھی۔۔۔ مگر اس وقت
 اس کے سر پر بھاری ذمہ داری تھی۔۔۔ وہ اس کے بوڑھے۔۔۔ ماں باپ تھے۔ وہ
 اب تک انہی کی وجہ سے کھل کر اپنے بدترین دشمن گہرام سے جنگ نہیں کر سکا
 تھا۔ اسے وڈیرے دریا خان پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وسان کا جی چاہا کہ اس وقت جا کر
 گہرام کی گردن مروڑ ڈالے۔۔۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور چاچے چاچی اور
 نوراں کے تحفظ کو یقینی بنائے گا۔ انہیں پہلے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کے
 بعد۔۔۔ وہ۔۔۔ گہرام سے گن گن کر بدلے لے گا۔ جس نے ان کا عرصہ حیات
 تنگ کر رکھا تھا۔

دونوں نیل گاڑیاں آگے پیچھے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی نما بل کھاتے
 دھول اڑاتے کچے رستے پر چل رہی تھیں۔ سب سے آگے۔۔۔ وسان اور اس کے
 خاندان کی نیل گاڑی تھی۔ پیچھے چاچا احمد بخش وغیرہ کی نیل گاڑی تھی۔ نیل گاڑیوں
 کے چوٹی بد ہیئت پہیوں کی چوں۔۔۔ چوں۔۔۔ چک۔۔۔ چوں۔۔۔ کی مخصوص
 افسانوی آواز۔۔۔ گوٹھ کی اس صبح سحر خیز فضا میں عجیب طلسم پیدا کر رہی تھی۔ مگر اس
 وقت یہ افسانوی آواز۔۔۔ ان حرماں نصیبوں اور ہجرت زدہ آندہ درگاہ لوگوں کے لیے
 مہجور دلوں پر چھریاں چلا رہی تھیں۔ کسی بھی لمحے کسی چھپے ہوئے طوفان کے اچانک اٹھ
 آنے والے متوقع اور اندیشناک احساس تلے۔۔۔ ان کے دل و دماغ بری طرح
 ٹھٹھکے ہوئے تھے۔ وسان کے چہرے پر ہڑ اعصاب خاموشی طاری تھی۔ صاحب ڈنوتا
 اس اطلاع نے اسے بری طرح اعصاب زدہ کر دیا تھا کہ گہرام کو پولیس نے زمیندار
 دریا خان کی ضمانت پر رہا کر دیا تھا۔ گویا۔۔۔ دوسری صورت میں گہرام جیسے سفاک
 شخص کو۔۔۔ کھل کر خوفناک بربریت پھیلانے کا دونوں طرف سے ٹھیکا مل چکا

تھا۔ دسان کو یہ جاں گسل خدشہ لاحق تھا کہ۔۔۔ گہرام اب کسی بھی لمحے زخم کھائے وحشی درندے کی مانند۔۔۔ نمودار ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ۔۔۔ دسان نے اس کے خوں آمیز بربریت کا اس انداز میں جواب دینے کے لیے۔۔۔ اس سے اس کے تینوں ساتھیوں سے چھینی ہوئی گنیں اب تک اپنے قبضے میں کر رکھی تھیں۔ البتہ تین گنوں کے گولیوں سے بھرے ہوئے میگزین اپنے قبضے میں اڑے ہوئے تھے اور خالی رائفلیں پھینک دی تھیں۔ جبکہ گہرام والی رائفل اس نے اپنے قریب ہی بیل گاڑی کے چوبی تختے والے فرش پر بکھری پیال کے نیچے چھپا رکھی تھی۔

دونوں بیل گاڑیاں درمیانی رفتار سے دوڑی جا رہی تھیں۔ عقب میں آبادی کے آثار معدوم ہونے لگے تھے۔ کھیتوں کے سلسلے بھی عبور کر آئے تھے۔ اب وہ ایک چھدری چھدری جھاڑیوں والے بڑے سے میدان سے گزر رہے تھے۔ دسان کے اعصاب جو کسی بھی لمحے متوقع خندوش حالات کے باعث تنے ہوئے تھے اب قدرے ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔۔۔ مگر اس کا مطلب بہر حال یہ نہ تھا کہ خطرے سے ٹل گیا تھا۔۔۔ ذرا دیر میں میدان بھی عبور ہو گیا۔ اب میدان سے نکلتا ہوا بیل کھاتا کچا راستہ۔۔۔ سامنے۔۔۔ نظر آنے والے۔۔۔ خودرو جھاڑیوں کے گنجان جھنگر میں گم ہو رہا تھا۔ یہاں جھاڑیاں قد آدم تھیں۔ دونوں بیل گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی اس گنجان جھنگر میں داخل ہو گئیں۔

شہر جانے والی پکی سڑک۔۔۔ ابھی۔۔۔ کچے کے اس ویران علاقے سے لگ بھگ کوئی چار پانچ کلومیٹر دور ہی تھی۔۔۔ وہاں سے شہر۔۔۔ پورے پندرہ کلومیٹر کی مسافت پر تھا اور دسان کی کوشش بھی یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد کم از کم اس کچی سڑک تک پہنچ جائے۔

قد آدم جھاڑیوں کا گنجان سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ابھی انہوں نے بہ مشکل تھوڑا ہی فیصلہ طے کیا ہو گا کہ معافی دائیں بائیں کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ

ابھری۔۔۔ اور پھر اگلے ہی لمحے۔۔۔ آٹھ دس گن بردار افراد۔۔۔ ان جھاڑیوں سے ابھر کر۔۔۔ ان کا راستہ روکے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے گہرا کر بیلوں کی رسی کھینچی۔ بیل السائی ہوئی آواز میں ڈکرا کر رک گئے۔۔۔ دسان کی کنپٹیوں پر آتش فشاں پھٹنے لگے تھے اور آنکھوں کے سامنے سرخ آندھیاں چلنے لگیں۔۔۔ کیوں کہ اس نے۔۔۔ ان گن برداروں کے درمیان میں اپنے بدترین دشمن گہرام کو چھپان لیا تھا۔ جو مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا کینہ ابھرا ہوا تھا۔ بے چاری نوراں بھی اس خندوش صورت حال سے لرز اٹھی۔۔۔ احمد بخش اور مٹھل وغیرہ جہاں کے تہاں۔۔۔ بیلوں کی رسی تھا مے خوف زدہ سے ان گن برداروں کو تنکے جا رہے تھے۔

”دسان۔۔۔! بابا تیرا کھیل ختم ہو گیا۔۔۔ نوراں کو اب ہمارے حوالے کر دے۔“ گہرام نے مسکراتے ہوئے دسان کو گھورتے ہوئے کہا۔ تو دسان کا مارے غیظ و جوش سے دماغ اٹنے لگا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ۔۔۔ پیال کے نیچے سے اپنی رائفل نکال کر گہرام پر تان لی اور غرا کر وحشت لہورینگ لہجے میں بولا۔

”ذلیل کتے! اب اگر تو نے دوبارہ اپنی گندی زبان سے میری بیوی کا نام لیا تو۔۔۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ ہٹ جا ہمارے راستے سے۔۔۔ ورنہ چھلنی کر کے رکھ دوں گا تجھے۔۔۔“

اس کی للکار پر گہرام کے چہرے پر سناٹے اتر آئے اور سنسنی خیز نظروں سے دسان کو گھورنے لگا۔ اس کے ساتھ کھڑے مسلح ساتھیوں کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک اتر آئی۔

بے چاری نوراں اور دونوں بوڑھے ماں باپ مارے دہشت کے لرزہ بر اندام تھے۔

”اڑے۔۔۔ لگتا ہے تجھے اپنی زندگی سے ہی نہیں اپنے بوڑھے ماں باپ

کی زندگی سے بھی پیار نہیں ہے۔“ گہرام نے سنسناتی آواز میں کہا۔

”میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔۔۔ نوراں کو۔۔۔“ ابھی اس بد خصلت نے اتنا ہی کہا تھا کہ وسان نے غصے سے دانت پیس کر اپنے ہاتھوں میں پکڑی رائل کی لمبی دبا دی۔ گولیوں کی بھینک تڑتڑاہٹ فضا میں بلند ہوئی۔۔۔ مگر اس سے پہلے ہی گہرام نے شاید وسان کی یہ خون ناک جنبش بھانپ لی تھی اس لئے وہ فوراً زمین پر گر گیا تھا۔ باقی اس کے عقب میں ساتھ کھڑے آٹھ دس گن بردار ساتھیوں میں تین وسان کی گولیوں کا نشانہ بن کر چیخ مار کر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔

باقیوں نے گہرام کی تقلید میں زمین پر گر گئے۔۔۔ بیل گاڑیوں پر اپنے ہتھیاروں کے آہنی دہانے کھول کر رکھ دیے۔ وسان خطرہ بھانپتے ہی۔۔۔ نوراں سمیت بیل گاڑی سے چھلانگ لگا کر قریب کی جھاڑیوں میں جا گرا۔

فضاء میں گولیوں کی بھینک تڑتڑاہٹ جاری تھی۔ اس کے ساتھ ہی بیلوں کے ڈکرانے کے علاوہ وسان اور نوراں کی سماعتوں میں اپنے بوڑھے ماں باپ کی چیخیں بھی سنائی دیں۔ نوراں کے حلق سے مارے شدتِ غم کے چیخ بلند ہونے لگی تھی۔ وسان کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے اپنے اور نوراں کے بوڑھے ماں باپ کو خون کی چھٹری میں پڑے پایا تو۔۔۔ اس کے اندر ایک ایسی آتش فشاں سلگ اٹھا تھا۔۔۔ اس نے ایک للکار زدہ دھاڑ ماری اور۔۔۔ رائل کا رخ زمین پر لیٹے گہرام اور اس کے ساتھیوں کی طرف لمبی دبا دی۔ دوسری ہی لمحے گہرام کے مزید چار ساتھی خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ ایک گولی گہرام کے بازو میں بھی لگی۔ وہ تڑپ کر۔۔۔ لوٹ لگتا ہوا اپنے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرک گیا۔ اس کے باقی بچے کچے تینوں ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اب دونوں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ بیل خوف زدہ ہو کر دوڑ کر لگا چکے تھے۔ فضا گولیوں کی گھن گرج سے گونج رہی تھی۔ وسان ان کے مقابلے میں تنہا

اور وہ چار تھے۔ اگرچہ گہرام زخمی تھا۔ مگر پھر بھی اسے وسان پر برتری حاصل تھی۔

وسان۔۔۔ اپنے دفاع میں فائرنگ کرتا ہوا۔ قد آدم جھاڑیوں کے اندر ہی اندر اپنی جگہ بھی تیزی سے بدل رہا تھا۔ نوراں اس کے ساتھ تھی۔ اس نے خالی میگزین نکال کر پھینکا اور دوسرا منچ کیا۔

اب اس کے پاس صرف دو فاضل میگزین بچے تھے۔ وسان کا سینہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لرزہ خیز انجام پر دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ نوراں بھی اپنے ماں کی موت پر غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ مگر اس وقت ان دونوں حالات کے ستائے ہوئے حرمان نصیبوں کو اپنی جان کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔

وسان بڑی جواں مردی کے ساتھ۔۔۔ اپنے چاروں دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا تھا۔ وہ خود سے زیادہ نوراں کا دفاع بھی کر رہا تھا۔۔۔ دشمنوں پر گولیاں برساتا ہوا۔۔۔ تیزی سے اپنی جگہ بھی تبدیل کرتا جا رہا تھا۔ اچانک دشمنوں کی جانب سے فائرنگ بند ہو گئی۔ وسان بھی رک گیا۔ ماحول میں تابوتوڑ گھن گرج کے بعد ایک ایسی ٹھنکنا ہوا سناٹا چھا گیا۔ وسان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے دشمنوں کی طرف سے اس ”مکارانہ“ خاموشی کو ان کی چال پر محمول کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ۔۔۔ وہ چاروں ان دونوں کو مختلف سمتوں سے گھیرنے کی کوشش میں مصروف کار ہو سکتے ہیں لہذا۔۔۔ وہ پہلے سے ہی محتاط ہو گیا۔

وہ نوراں کو کسی محفوظ جگہ دبکاتا چاہتا تھا۔ ورنہ نوراں کسی بھی وقت اس کی کمزوری کا باعث بن سکتی تھی اس نے متلاشی نظروں سے جھاڑیوں میں دیکھے ہوئے بغور اپنے گرد و پیش دیکھا۔ اسے اپنی دائیں جانب ذرا فاصلے پر۔۔۔ ایک کھوہ نظر آئی۔ یہ تو شاید۔۔۔ گیدڑوں کا کوئی بھٹ تھا۔ وہ نوراں کا ہاتھ پکڑے تیزی سے اس طرف رینگ گیا پھر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اندر سے خالی ہے۔ اس نے نوراں کو سکڑ سمٹ کر اندر سما جانے کو کہا۔ وہ بے چاری۔۔۔ فوراً کھوہ کے اندر سمٹ کر بیٹھ گئی

وسان نے کھوہ کے دہانے پر جلدی جلدی خشک جھاڑیوں کا ڈھیر سرکا دیا۔ پھر بہ سرعت ایک طرف ریگ گیا۔ اب وہ ٹھکے ہوئے جنگلی بلے کی طرح سر تاپا سماعت بنا جھاڑیوں کی اوٹ میں دبکا چاروں طرف کی سن گن یا کسی آہٹ پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

”معا۔۔۔۔۔ اسے اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ گہرام کا ایک ساتھی۔۔۔ اس پر فائر کرنے کیلئے پر تول رہا تھا۔ وسان نے تیزی سے پلٹنے کے دوران یہ عقل مندی کی تھی کہ اس نے ایک ہاتھ سے مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا نما پتھر اٹھا لیا تھا۔ اور پلٹتے ہی آؤدیکھنا تاؤدہ کچا پتھر دشمن کے چہرے پر رسید کر دیا۔ اس نے لبلبی دبا دی۔ خشکی ہوئی دم بہ خود فضا میں برسٹ چلنے کی سمع خراش آواز ابھری۔ اور وسان کو اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گولیوں کی مہیب باڑ کی سفاک ”جھپک“ محسوس ہوئی۔ اگر دشمن کا نشانہ خطانہ جاتا تو۔۔۔ اس کی برساکی ہوئی گولیوں سے وسان کا چہرہ ہی اڑ جاتا۔ اب وسان کو اپنی رائفل چلانے کا موقع مل چکا تھا۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ دشمن مکروہ چیخ کے ساتھ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا تو اچانک اس پر کسی نے چھلانگ لگا دی۔ یہ حملہ اس کیلئے غیر متوقع تھا۔ نتیجتاً۔۔۔ ایک لمحے کو وہ بوکھلا گیا۔ مگر اپنے حتمی پڑتے حواسوں کو بحال رکھتے ہوئے۔۔۔ اس نے اپنی رائفل پر ڈھیلی پڑتی گرفت مضبوطی سے جمائی اور تیزی سے زمین پر لیٹے لیٹے لوٹ لگائی۔۔۔ حملہ آور نے اپنی رائفل کا کندبٹ اس کے سر پر مارنے کی کوشش کی تھی جو وسان کے سر پر تو نہ لگی البتہ اس کے کاندھے پر اس کی بھرپور ضرب پڑی۔ درد کی ایک تیز سنسناتی لہر اس کے پورے مضروب وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔ مگر یہ وقت اپنی چوٹ سہلانے کا نہ تھا۔ اس نے اپنے جبرے بھینچتے ہوئے کراہتی ہوئی تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کی اور حملہ آور کی ناک پر موقع ناک کر ایک گھونسا جڑ دیا۔ حملہ آور کے حلق سے اذیت ناک کراہ خارج ہو گئی۔۔۔ اس کی ناک پچک گئی تھی۔ وہاں سے بھل بھل خون جاری ہو گیا۔ وسان نے اسے

سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمایا۔ زخمی حملہ آور کی کھوپڑی چٹخ مٹی۔ وہ تورا کر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ وسان اپنے کاندھے کا درد سہلاتا ہوا۔۔۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح کی سحر خیزی اب ابھرتے سورج کی تیز روشنی میں بدلنے لگی تھی۔ اس روشنی میں بالکل سامنے۔۔۔ چند گز کے فاصلے پر اس نے کسی کو ابھرتے دیکھا۔۔۔ وسان کے پاس اس پر فائر کرنے کا وقت نہ تھا۔ کیونکہ۔۔۔ اس نے ابھرتے ہی بلا کی پھرتی کے ساتھ اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کیا تھا۔ وسان پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں میں جھک گیا اور تیزی سے ایک طرف کورینگ گیا۔ دشمن کی طرف سے داغی ہوئی گولیوں کا برسٹ عین اسی جگہ ”ٹارٹ“ کی آواز سے پڑا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے۔۔۔ وسان موجود تھا۔ وسان نے بھر بھری مٹی والی جھنڈ دار زمین پر لیٹے لیٹے جھاڑیوں کے چھدرے روزنوں سے دشمن کا خاکہ دیکھا۔۔۔ اور نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ اس کی رائفل سے گولیوں کی پوری خوں ناک باڑ اگلی اور دشمن ایک مکروہ چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

”وسان! رائفل پھینک دے۔۔۔۔۔ ورنہ نوراں کو گولی مار دوں گا۔“

قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی للکار اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور وسان نے پلٹ کر عقب میں دیکھا تو جیسے پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ گہرام نے اس کی بیوی نوراں کو دیوچ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سفاکی چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ بے چاری نوراں کا چہرہ خوف سے ریتان زدہ نظر آ رہا تھا۔ گہرام کے بازو میں اجرک کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ زخم وسان نے گولی کی صورت میں اسے لگایا تھا۔

”اس کو چھوڑ دے کتے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔“ وسان قہر آلود لہجے میں دھاڑا اور اپنی رائفل سیدھی کر لی۔

”خبردار۔۔۔ گولی چلائی تو۔۔۔ یہ شہزادی۔۔۔ خون میں نہا جائے گی؟“

گہرام نے سفاک لہجے میں پھنکار تے ہوئے وسان سے کہا۔۔۔ اس

بدبخت نے بے چاری نوراں کو۔۔۔ اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔۔۔ رائفل گہرام۔۔۔
بائیں ہاتھ میں بھی جس کا رخ وسان کی طرف ہی تھا۔ جبکہ دائیں ہاتھ کے شکنجے کو اس
نے نوراں کی گردن کے گرد جمائل کر کے اسے اپنے آگے کر رکھا تھا۔

اپنی نازک اندام بیوی کو اپنے بدترین اور ذلیل صفت دشمن کے شکنجے میں
اس طرح جکڑے دیکھا تو وسان کی سسکتی ہوئی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر وہ بے لبر
تھا۔

”رائفل پھینک دے۔۔۔ وسان!“ گہرام نے غرا کر کہا۔

وسان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے بے بسی سے ہونٹ
کاٹتے ہوئے شکست خوردہ انداز میں رائفل ایک طرف پھینک دی۔ اس کی رائفل
پھینکنے کی دیر تھی کہ گہرام نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کی لمبی دبا دی۔
گولیوں سمع خراش تڑتڑا ہٹ ابھری۔۔۔ وسان نے خود کو گولیوں کی اس بوچھاڑ سے
بچانے کی کوشش کی۔۔۔ مگر۔۔۔ چند گولیوں نے اس کے بائیں بازو کو بری طرح
چھید ڈالا۔ وسان کے حلق سے اذیت بھری چیخ بلند ہوئی تو نوراں اپنے محبوب شوہر کو
خون میں لت پت دیکھ کر انتہائی غم و دکھ کے احساس سے چلائی۔ وسان کے قدم
لڑکھڑائے۔ ادھر اپنے شوہر کو گہرام جیسے رد لیل کتے کے رحم و کرم پر دیکھ کر نوراں کے
اندر پہلی بار اپنی بقاء کیلئے بے دریغ جرات پیدا ہوئی اور اس نے انتہائی جنونانہ انداز
میں اپنی کہنی پوری قوت سے گہرام کے پیٹ میں رسید کر ڈالی۔ گہرام کو نوراں سے ایسی
جرات کی توقع نہ تھی۔ ایک لمحے کو وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ اس کے بازو
کے شکنجے سے جیسے ہی نوراں کی گردن آزاد ہوئی نوراں نے رکوع کے بل جھکے گہرام
کو زور سے دھکا دیا۔ گہرام چند قدم عقب میں لڑکھرایا اور پھر ناہموار زمین سے اس کا
ایک پاؤں رہٹ گیا۔ وہ نیچے گرا۔۔۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ادھر
وسان نے دانت بھیج کر اپنے زخمی بازو کی تکلیف پر قابو پایا اور وحشیانہ دھاڑ کے

ساتھ۔۔۔ گہرام پر چھٹا۔ گہرام نے سنبھلتے ہی وسان کے زخمی اور خون آلود بازو پر مکہ
جڑ دیا۔ وسان کیلئے دوسری اذیت ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔۔۔ باعث تکلیف
بے اختیار چیخا۔ گہرام نے اٹھ کر زمین پر گری رائفل کو اچکنے کیلئے دوڑ
لگائی۔۔۔ وسان جانتا تھا کہ ایک بار اس خونی درندے کے ہاتھ رائفل لگنے کا مطلب
اس کی بھیانک موت تھی۔ چنانچہ وہ اپنی تکلیف بھلا کر گہرام کے پیچھے لپکا۔ نوراں
ایک طرف ہر اس اہرنی کی مانند متوحش لگا ہوں سے یہ خونی جنگ دیکھ رہی تھی۔

گہرام رائفل اٹھانے کیلئے جیسے ہی جھکا تو وسان بھی اتنی دیر میں اس کے
قریب پہنچ گیا تھا اس نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ ایک زوردار لات رائفل اٹھانے
کیلئے جھکے ہوئے گہرام کی پشت پر رسید کر دی۔ گہرام زمین پر الٹ گیا۔ مگر وہ رائفل
پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ پشت کے بل زمین پر لیٹے لیٹے ہی رائفل کا
رخ وسان کی طرف کرنے لگا تو وسان اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔۔۔ اس کا بایاں
بازو گولیوں سے پھلنی تھا۔ جو تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری
تھی۔ اس پر وحشیانہ جنون سوار تھا۔ جو ہر صورت میں اپنے بدترین دشمن کو جلد سے جلد
نا بود کرنے کے درپے ہو رہا تھا۔ لہذا وہ اپنے دائیں ہاتھ کی طاقت کو بروئے کار لاتے
ہوئے گہرام کی رائفل چھیننے کیلئے زور آزمائی کرنے لگا اگرچہ گہرام کا ایک بازو بھی
زخمی تھا مگر اس کا زخم۔۔۔ بہر حال وسان کے زخم سے کم گہرا اور معمولی تھا۔ اس لئے وہ
تقریباً اپنے دونوں ہی بازوؤں کی طاقت لگانے میں مصروف کار تھا۔ دونوں کے
چہرے سرخ تھے۔ آنکھوں میں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی سفاکی اتری ہوئی تھی۔
پھر ایک موقع پر گہرام نے اپنے چاروں شانے چت وجود کو جھٹکے سے پلٹا۔۔۔ اب وہ
وسان کے اوپر تھا۔ مگر۔۔۔ وسان نے اپنے مضروب وجود کی پوری طاقت ایک بازو
پر مجتمع کرتے ہوئے رائفل پر گرفت مضبوطی سے جما رکھی اور تب پھر اچانک گہرام نے
اپنے سر کی بھر پور زور وسان کی ناک پر ماری۔ وسان ایک لمحے کو بلبللا اٹھا۔۔۔ رائفل پر

پھاڑ کر لپیٹ دیں۔ پھر وسان نوراں کو اپنے دائیں بازو سے قریب کرتے ہوئے عجیب سی طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

”نوراں۔۔۔ ظلم کی سیاہ رات تمام ہوئی۔۔۔ آؤ۔۔۔ سڑک اب زیادہ دور نہیں۔۔۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے سہارے شہر جانے والی سڑک کی طرف چل دیے۔

☆.....ختم شد.....☆

اس کے ہاتھ کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑنے لگی تو گہرام نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے رائفل جھپٹ لی۔ وسان کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ گہرام رائفل پر کامیابی سے اپنا قبضہ جمائے کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا تو۔۔۔ اچانک اسے اپنے سر پر قیامت ٹوٹی محسوس ہوئی۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا۔ لگا۔ وسان نے اس کے عقب میں کھڑی نوراں کو دیکھ لیا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ جو وسان ہی کی تھی اور اس نے گہرام کی دھمکی پر پھینکی تھی اور جانے کسی وقت نوراں نے اپنے شوہر کو خطرے میں بھانپ کر اسے اٹھا لیا تھا۔ گہرام کے عقب میں اس نے رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر اس کا ٹھوس کندھا ذلیل صفت گہرام کے سر پر دے مارا تھا۔ وسان کیلئے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ اس نے پھر کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگائی ادھر نوراں نے دوبارہ رائفل سے لٹھ کا وار کیا۔ تو گہرام کو اپنے کندھے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئی وہ۔۔۔ حلق کے بل چیخا وسان نے لڑکھڑاتے گہرام کے ہاتھ سے رائفل جھپٹ لی۔۔۔ گہرام کو ہوش آیا تو وہ۔۔۔ غرا کر نوراں کی طرف جھپٹا۔۔۔ مگر وسان نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ گہرام کے حلق سے دلخراش چیخ ابھری اور وہ۔۔۔ وہیں نوراں کے قدموں میں گر کر چند ثانیے تڑپنے کے بعد ٹھنڈا پڑ گیا۔ نوراں نے انتہائی نفرت سے اس کے مردہ چہرے پر تھوک دیا وسان نے رائفل پھینک دی۔ نوراں تڑپ کر اس کی طرف بڑھی۔

”سائیں۔۔۔ ات۔۔۔ تم۔۔۔“

”کچھ نہیں ہوا ہے۔ نوراں؟“ وسان کے تھکے تھکے لہجے میں از حد طمانیت تھی۔

”مم۔۔۔ مگر سائیں۔۔۔! تم بہت زخمی ہو۔۔۔۔۔؟“ نوراں پر تشویش لہجے میں بولی۔ تو وسان نے اسے اپنی اجرک اتار کر دی اپنے زخمی بازو کے گرد لپیٹنے کو کہا۔ نوراں نے جلدی جلدی۔۔۔ وسان کے خون آلود بازو میں اجرک کی لیریں

تھوٹھنی چاند کی جانب اٹھا کر زور سے اپنی منخوس آواز میں چلایا تو گھمبیر سنائے کی چادر دور تک چرتی چلی گئی۔

یہ تھرکار ریگستان تھا، جس کی آغوش، شب میں ممتا کی طرح ٹھنڈی اور دن میں پدرانہ شفقت کی طرح گرم جوش ہوتی ہے۔ دن بھر چلنے والی بادِ سموم اب خنکی میں ڈھل کر تھوہرا اور آک بوہ کے پودوں میں سرسرا رہی تھی، ذرا قریب ایک بڑے سے جبل بھٹ (ریٹیلٹیللا) پر اگی ہوئیں کند باوری کی جھاڑیوں میں گھبرایا ہوا جنکارہ اپنی تھوٹھنی دیکائے، چندھی آنکھوں سے سامنے ذرا فاصلے پر یکسر تلے بنی ایک کنیا کو ننگے جا رہا تھا جس کے اندر سے دھیمی دھیمی روشنی پھوٹ رہی تھی اور ساتھ ہی کسی کے رونے، سسکنے کی آوازیں بھی آرہیں تھیں۔

اس دور افتادہ صحرا میں رونے اور سسکنے کی آوازیں عجیب اور پراسرار سا سماں پیدا کر رہی تھیں۔

کنیا کے اندر دیے کی روشنی میں ایک مجذوب سا شخص اپنا جھاڑ جھنکاڑ بالوں والا سر گھٹنوں میں دیئے سسک رہا تھا، وہ گہری سانولی رنگت کا ایک نوجوان شخص تھا اس کے علاوہ دو افراد بھی اس کے قریب سامنے کھجی کی چٹائی پر بیٹھے تھے، وہ اپنے حلیے سے ہاری دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی رنگت بھی سانولی تھی۔ انہوں نے ستر پوشی کے طور پر ایک میلی سی لاک (تہبند) اور خستہ سی صدری پہن رکھی تھی۔ مذکورہ افراد میں سے ایک جو نسبتاً عمر رسیدہ تھا اور کافی روہانسا ہو رہا تھا۔ جبکہ دوسرا خاموش تھا۔

”رے سانول۔۔۔ تیکوں (تجے) کیا ہو گیا ہے رے۔۔۔ یہ۔۔۔ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ بوڑھا شخص دلگیر لہجے میں نوجوان مجذوب سے بولا۔

یہ اس کا باپ مٹھل تھا جو سانول کی حالت پر کڑھا جا رہا تھا وہ بارہ بولا۔
”مینڈا پٹ (میرے بچے) میکوں ڈس تو سہی (مجھے بتا تو سہی) تیکوں آخر کیرا (کونسا) روگ لگا ہے کہ بالکل ہی بیگانہ ہو گیا ہے رے تو۔۔۔ اپنے پیو

دشت پر خار

تاریک رات اپنے پنچے، لبق و دق صحرا میں گاڑ چکی تھی۔ پوری تاریخوں کا چاند کسی سوگوار ناری کے تلک کی طرح آغوش پرانکا ہوا تھا، اس کی اُداس روشنی ریتلے ٹیلوں پر عجیب پراسراریت سی طاری کر رہی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے چاند نے ستاروں کی فوج سمیت آسمان پر یلغار کر رکھی ہو، پورے ماحول پر ایسا مہیب سا ناٹا طاری تھا جیسے ابھی ابھی ان گنت خوفناک بلائیں جیتی چٹکھاڑتی ہوئی گزری ہوں غرض چار سو دور نزدیک ایک سحر کی سی کیفیت رچی ہوئی تھی، کسی انہونی کے ہو جانے کا سا احساس ہو رہا تھا۔

معا قریبی ٹیلے پر ایک جھجھکسا گیدڑ نمودار ہوا اور میکا نیکی انداز میں اپنی

(باپ) کو بھی کچھ نہیں بتائے گا۔

اپنے باپ کی بات سن کر سانول نے اپنا سر اٹھایا تو اس کی ویران آنکھیں پیش منظر کی بجائے پس منظر کی کسی غیر مرئی شے کو نکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جب اس نے بولنا شروع کیا تو اس کا لفظ لفظ گہرے دکھ اور درد کی غمازی کر رہا تھا۔

”بابا تو۔۔۔ یہاں نہ آیا کر۔۔۔ تو چلا جا، مجھے اکیلا چھوڑ دے، میرے حال پہ۔۔۔“

”کیسے چھوڑ دوں رے۔۔۔ تیکوں میں ہتھے (یہاں) اکیلا۔“ اس کا باپ یکدم بھڑک اٹھا۔

”تو میری عمر بھر کی کمائی ہے پٹ۔۔۔ اپنے کڑیل پٹ کو اس حال میں دیکھ کر کس باپ کا جگر نہیں کٹتا ہوگا رے۔۔۔“

”بابا۔۔۔ میکوں احساس ہے۔ پر میں کے کرساں (کیا کروں) میکوں ہتھے سکھ ملتا ہے۔“ سانول نے بے بسی سے جواب دیا۔ پھر توقف سے بولا۔

”بابا۔۔۔ تو میکوں جیندہ دیکھنا چاہتا ہے تو مجھے ہتھے پڑا رہنے دے۔“

سانول نے اتنا کہہ کر اپنا سر دوبارہ گھٹنوں کی طرف جھکا دیا۔ اب اس کی

ویران آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔ اس کا باپ اپنا دل مسوس کر رہ گیا، وہ دراصل

اپنے بیٹے کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بیٹا ضد کا پکا ہے

اس کے باوجود وہ اسے واپس گھر لے جانے کے لیے آجاتا تھا، دوسرا شخص اس

بوڑھے کا چھوٹا بھائی تھا جو رشتے میں سانول کا چچا لگتا تھا۔ اس کا نام پیرل تھا۔۔۔ وہ

ایک موقع پرست تھا اور لالچی شخص تھا۔۔۔ مگر اس وقت وہ خاموشی سے باپ بیٹے کی

مفتنگوں رہا تھا۔

بوڑھے مٹھل کو آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ اس کے جوان بیٹے کو

آخر ہوا کیا ہے؟ کیونکہ اس سے قبل سانول بھلا چنگا اور گوٹھ کے عام نوجوانوں کی

طرح کھنڈر سا ہوا کرتا تھا مگر پھر اچانک کیا ہوا کہ اپنا گھربار ماں باپ، بھائی بہن، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیرا گیوں کی طرح اس ویران صحرا میں آن بسا۔ اس کی اس حرکت سے اس کے باپ کو برا رخ پہنچا تھا۔ گوٹھ کے کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس پر کسی جن، جھپٹ کا سایہ ہے، بعض تو سانول کی ملنگوں والی کیفیت دیکھ کر اسے پیر فقیر سمجھنے لگے تھے اور منتوی مرادوں کے ساتھ اس کے ”آستانے“ (جھونپڑی) حاضری دینے لگے تھے مگر سانول ہر شے سے لاتعلقی اور بیگانہ اپنے حال میں مست رہتا۔

غرض کوئی نہیں جانتا تھا کہ اچھے بھلے نوجوان سانول کو آخر ایسا کون سا روگ لگا ہے کہ وہ ہر چیز سے بالکل بیگانہ ہو گیا تھا، نا ہی وہ خود کسی کو کچھ بتاتا تھا۔

اپنے بیٹے سانول سے مایوس ہو کر بالا خراس کا بوڑھا باپ مٹھل جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

البتہ اس کا چاچا پیرل وہاں موجود تھا، وہ اب تک خاموش رہا تھا مگر اپنے

بڑے بھائی کے جھونپڑی سے نکلتے ہی اس کی آنکھوں میں یکدم ایک عجیب سی چمک عود

کر آئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی پھولدار پوٹلی میں بندھے ایک برتن کو باہر نکالتے

ہوئے سانول سے خوشامدی لہجے میں بولا۔

”رے۔۔۔ بالک۔۔۔ تو غم نہ کر۔۔۔ یہ لے۔۔۔ یہ کھمبیوں کا بوڑ

(سالن) لایا ہوں میں تیرے واسطے۔۔۔ تجھے پسند ہے نا۔۔۔!“ یہ کہہ کر چاچا پیرل

اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے سانول کو دیکھنے لگا پھر اسے خاموش پا کر پریتر ابد لیتے

ہوئے ملائمت سے دوبارہ بولا۔

”ویسے سانولے۔۔۔ تیکو ہیک گل دساں (تجھے ایک بات بتاؤں)

پورے گوٹھ میں تیرے چرچے ہو رہے ہیں تیکو سب ”بھٹ سائیں، بھٹ

سائیں“ آکھنے لگے ہیں۔“

”چاچا۔۔۔ اللہ واسطے تو چلا جا یہاں سے، مجھے اکیلا چھوڑ دے۔“ بالا خر

سانول اس کی چرب زبانی سے بیزار ہو کر بولا۔

”چا چا۔۔۔ میں خود عاجز بندہ ہوں، گناہگار ہوں۔۔۔ اللہ سائیں میکو معاف کرے۔“

اس کی بات سن کر پیرل اپنا سامنہ لے کر جھونپڑی سے باہر نکل گیا درحقیقت پیرل ایک حریص شخص تھا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ کسی طرح سے اپنے مجذوب بھتیجے کو بہلا پھسلا کر پیری، مریدی کی جانب راغب کر کے خود اس کا معتمد خاص بن کر سادہ لوح لوگوں سے کچھ بڑھتا رہے مگر سانول کے جواب نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ اندر سے سانول کی درد بھری آواز ابھر رہی تھی، وہ شاہ عبداللطیف کی لازوال شاعری گنگنا رہا تھا۔

وہی	بھید	بقا	کا	پائیں
ہو	گئے	جو	تا بود	
وہی	پہنچے	در	پہ	تیرے
بھولے	جو	بھی	وجود	
کرم	ہو	تیرا	گمراہوں	پر
آن	کریں	وہ	سجود	

☆.....☆.....☆

قرمزی پتھروں سے بنی یہ حویلی اپنے کینوں کی شان جیسی بلند تھی مگر اس ریگستانی گاؤں کی سرزمین پر جہاں سرکنڈوں اور کچے پکے ڈھلوان چھتوں والے گھر اور جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں، ان کے بیچ یہ حویلی عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھی۔

یہ حویلی ایک اونچے نیلے پر بنی ہوئی تھی حویلی کے دیوہیکل دروازے پر مسلح گارڈ مستعدی سے جدید ساخت کی گئیں تھامے کھڑے تھے، ان کے چہرے خاکستری اور مونچھیں صحرائی پچھو کے ڈنک کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ حویلی کے کشادہ احاطے

میں سفید رنگ کی بجیر و کھڑی تھی، اس بلند و بالا حویلی کے دروہام، غلام گردشوں اور چکر دار زینوں کے درمیان ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں اس وقت درباری سناٹا طاری تھا، کمرے کی دیواروں پر خاندان کے پرکھوں کی رعونت آمیز تصاویر بڑے بڑے فریموں میں لگی ہوئی تھیں، نایاب حنوط شدہ پرندوں کے مجسمے، مور کے پر اور جانوروں کے بڑے بڑے سر کے علاوہ چیتوں کی کھالیں بھی کمرے کی گھمبیر فضاء کو پُر رعب بنانے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ غرض کمرے کی تزئین و آرائش میں استعمال ہونے والی تمام اشیاء سے ایک دبذبہ اور خاص حد تک سخت گیری نمایاں تھی۔

وسیع کمرے کے پتھوں بیچ دبیز قالین پر بچھے ایک شاندار اور قدرے اونچے صوفے پر ایک بھاری بھر کم اور غلافی کتھوں والی شخصیت براجمان تھی جس کی گھنی داڑھی اور اٹھی مونچھیں اس کا رعب اور آنکھوں کی رعونت کو نمایاں کر رہی تھیں۔ کلف لگے پیش قیمت شلوار سوٹ اس کے مزاج کے اکڑاؤ کی غمازی کر رہے تھے، ہاتھوں کی انگلیوں میں طلائی اور یاقوت جڑی انگوٹھیاں بھی اپنی چمک دکھا کر رہی تھیں۔ یہ ایک با اثر و ڈیرائیس جونگل خان تھا اور اس کے برابر والے صوفے پر اپنی بھرپور توند کے ساتھ ڈی ایس پی سبھا گو خان دھنسا ہوا تھا۔ ان کے قریب ہی ایک خاصی چوڑی سی ٹیبل پر اشیائے خورد و نوش رکھی ہوئی تھیں اور چربیلہ فرہبی مائل ڈی ایس پی ایک سالم پٹھور بھنبھوڑنے میں مصروف تھا، سامنے قطار کی صورت میں مفلوک الحال ہاری اور مزارعوں کے علاوہ خدمت چاکری کرنے والے کچھ ملازمین بھی ہاتھ باندھے مودب کھڑے تھے۔

اتنے میں ایک خستہ حال مجھول سا شخص ہاتھ جوڑے وڈیرا جونگل خان کے سامنے آیا اور تقریباً گڑ گڑاتے ہوئے بولا۔

”دس۔۔۔ سائیں۔۔۔ وڈا۔۔۔ بھوتار۔۔۔ مم۔۔۔ میری

ہک (ایک) عرضی ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ میری زال (بیوی) ڈھکی (امید سے) ہو گئی ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔

”اڑے بابا جبل۔۔۔“ وڈیرا ریکس جونگل خان زور سے دھاڑا اور قریب ہی مودب کھڑا مٹھی سا ایک شخص باریک تار کی طرح جھنجھٹا اٹھا، اس کا پورا نام جبل سندھو تھا، وہ وڈیرے کا بیک وقت فشی اور مصاحب خاص تھا۔ مستعدی سے بولا۔

”حاضر سائیں۔۔۔“

”اڑے بابا۔۔۔ کیا مسئلہ ہے اس کا“ وڈیرا جونگل خان خشونت سے بولا۔

”سائیں وڈا۔۔۔ وہ ہے نا۔۔۔ عجیباں۔۔۔ مائی عجیباں۔۔۔ جیسے آپ

نے چھوٹی وڈیرانی کی کھد مت کے واسطے رکھا ہے۔۔۔ وہ۔۔۔“

”جبل۔۔۔“ جونگل خان ایک بار پھر گرجدار آواز میں دھاڑا اور مٹی نے کچھوے کی طرح اپنی گردن شانوں کے بیچ دبا لی۔

”بابا تو اتنی تفصیل میں کیوں جاتا ہے۔۔۔ اپنا بندوبست کروانا ہے تو بتا بابا۔۔۔“

وڈیرے کی بات سن کر مٹی نے بغیر تمہید کے بولنا شروع کر دیا۔

”سس۔۔۔ سائیں وڈا۔۔۔ یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی زال ڈھکی ہے، اسے

آرام کے لیے کچھ دنوں کی چھٹی چاہئے۔“

”چنگا بابا چنگا۔۔۔“ وڈیرا اس کی بات سن کر بولا اور گویا حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی بیٹی بھاگ بھری کو حویلی میں بھیج دینا۔۔۔ وہ اپنی ماں کی جگہ کام سنبھال لے گی۔“

اتنا کہہ کر وڈیرا جونگل ایک دوسرے شخص کی جانب متوجہ ہوا جس نے اجرک کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔

”ہاں بابا۔۔۔ ہاتو۔۔۔ عمر کوٹ اور سارو کی بیویں (کھیتوں اور زمینوں) کا حساب دے۔۔۔ خالقوتیار ہاتھا کہ تو بیویں کو دیر سے بیاتا ہے، بواتا ہے۔“

ادھر وہ مجہول سا بے چارہ بوڑھا فریادی جواباً کچھ کہتا چاہتا تھا مگر وڈیرے کا روئے سخن دوسری جانب ہوتے دیکھ کر وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا اور ادھر وڈیرے نے جسے ہاتو کہہ کر مخاطب کیا تھا، وہ اب ذرا قریب آچکا تھا۔ اس نے اجرک کی پگڑی اپنے سر سے اتاری، اب اس کے سر پر شیشوں کے کام والی سندھی ٹوپی نظر آرہی تھی وہ اسے درست کرتے ہوئے بولا۔

”سائیں بھوتار۔۔۔ ایک بری خبر لایا ہوں۔“

”اڑے پہلے جو پوچھا ہے وہ بتا۔۔۔ زمینیں کیوں سوکھی پڑ رہی ہیں آخر۔۔۔“ وڈیرا کھٹکی سے گونجیلی آواز میں بولا۔

”سائیں اس بات کا تعلق اس بری خبر سے ہے جو میں لایا ہوں۔“ ہاتو نے اسی روانی سے جواب دیا۔ لگتا تھا وہ وڈیرے کے لہجے کا عادی تھا۔

”اڑے بابا پھر۔۔۔ بولتا کیوں نہیں ہے۔۔۔ کیا بری خبر ہے بھلا ہم سے بھی بری کوئی خبر ہو سکتی ہے۔“

وڈیرا اس کی بات سن کر رعونت سے بولا اس کی گھنی اور بڑی بڑی مونچھیں کھرکھرا رہی تھیں اور آنکھوں میں شکرے جیسی چمک عود کر آئی تھی۔

”سائیں وڈا۔۔۔ عمر کوٹ کی زمینوں کے لیے جو واٹر کورس منظور کروائے تھے نا آپ نے۔۔۔ وہ سب سرکار نے منسوخ کر دیئے ہیں، ابھی ہم اسکی مرمت ہی کروا رہے تھے کہ۔۔۔“

”جبل۔۔۔“ وڈیرا جونگل نے قدرے بلند آواز میں جبل کو پکارا اور ہاتو اپنی بات کا گلا گھٹتے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔

”حاضر سائیں۔۔۔“ جبل اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”سیکرٹری آب سے بات کراؤ۔“

”حاضر سائیں۔۔۔“

منشی کو حکم دینے کے بعد وڈیرا جونگل خان اپنے قریب بیٹھے ڈی ایس پی سبھاگو خان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”دیکھ رہے ہوتا۔۔۔ ڈی ایس پی صاحب۔۔۔ ہم سیاست سے آوٹ کیا ہوئے کہ مخالفین نے ہمارے آگے روڑے اٹکانے شروع کر دیئے۔“

اس کی بات پر سبھاگو خان کو یا فلسفانہ انداز میں جواب بولا۔

”جونگل سائیں۔۔۔ سیاست کا سورج تو بس ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ چڑھتا

ہے تو لوگ پوجتے ہیں اترتا ہے تو بھولتے ہیں۔“

”مگر ڈی ایس پی صاحب۔۔۔ ہم سیاست سے نہیں ہیں۔۔۔ سیاست

ہم سے ہے۔“ وڈیرا آخر میں اپنی کھنی مونچھوں کو مزور تے ہوئے بولا۔ اتنے میں منشی جبل نے جونگل کو موبائل تھماتے ہوئے کہا۔

”بھوتار سائیں۔۔۔ سیکرٹری صاحب لائن پر ہیں۔“

”ہالو بابا۔۔۔ سیکرٹری صاحب۔۔۔“ وڈیرا جونگل منشی سے موبائل لیتے

ہوئے بولا۔

”ہاں جی۔۔۔ وڈیرا سائیں۔۔۔ کیسے ہیں مزاج۔۔۔ کیسے یاد

فرمایا۔“ دوسری جان سے سیکرٹری کی دوستانہ آواز ابھری تھی۔

”بابا۔۔۔ تم سناؤ پہلے۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔ آؤنا۔۔۔ کبھی گوٹھ۔۔۔ ہماری

کچھری کو بھی رونق بخشو نا بابا۔۔۔ آج کل تو بھٹ تیزوں کا موسم ہے، یہاں کوئی شکار وکار ہی ہو جائے۔“

”بہت بہت شکریہ جونگل سائیں۔۔۔ ضرور آئیں گے۔۔۔ آپ

سائیں کیسے یاد کیا؟“ سیکرٹری نے گویا فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے پوچھا۔

”بابا۔۔۔ وہ ہمارے کچھ واٹر کورس منسوخ ہو گئے ہیں حالانکہ ہمارا صوبائی

سرکار سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ہم سارے واٹر کورس اپنی مدد آپ کے تحت تعمیر کروائیں

گے۔۔۔ اب اس پر ہمارا لاکھوں کروڑوں لگ چکا ہے تو اچانک معلوم ہوا ہے کہ یہ

منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔۔۔ آخر کیا معاملہ ہے یہ۔۔۔“ جونگل خان نے اپنی بات

ختم کی تو دوسری جانب چند ٹائیپے خاموشی چھائی رہی پھر سیکرٹری کی دوبارہ آواز سنائی

دی۔

”ہاں۔۔۔ آپ کی بات درست ہے۔۔۔ دراصل اعلیٰ سطح پر کچھ ہنگامی

تبدیلیاں ہوئی ہیں۔۔۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی سیاسی تبدیلیوں کے

ہونے سے کچھ مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔۔۔ مگر سب وقتی ہیں۔۔۔ وقت کے ساتھ

ساتھ سب سرد پڑتا جائے گا لہذا آپ بے فکر رہیں۔۔۔ میں آپ کا کام کرنے کی

کوشش کروں گا۔“

”بہت مہربانی سیکرٹری صاحب بس یہی کہنا تھا۔“ وڈیرا بات ختم کرنے کی

غرض سے آخر میں بولا اور پھر چند اختتامی کلمات ادا کرنے کے بعد اس نے موبائل

دوبارہ منشی کو تھما دیا۔

جونگل خان کو فارغ پا کر قریب بیٹھا ڈی ایس پی گلا کھنکارتے ہوئے فی

الغور بولا۔ ”جونگل سائیں۔۔۔ آپ کے پاس ایک گزارش لے کر حاضر ہوا تھا اگر

آپ تنہائی میں چند منٹ میرے ساتھ گزار لیں تو عنایت ہوگی۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بابا کیوں نہیں۔“

جونگل خان فراخ دلی سے بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنے قریب بوتل کے

جن کی طرح کھڑے منشی کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر چند ہی لمحے بعد کمرے میں ان

دونوں کے سوا اور کوئی نہ رہا۔

”ہاں بابا۔۔۔ ڈی ایس پی صاحب۔۔۔ اب بولو۔“ جونگل خان کچھ دیر

بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”سائیں۔۔۔ وہ مھلگری والا معاملہ ہے ذرا۔۔۔“ سجاگو کچھ جھکتے

ہوئے بولا۔

”ہالا بابا ہالا۔۔۔ بولو۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔“ جونگل خان بولا۔

سجاگو خان نے اندازہ لگایا کہ اس کی بات پر جونگل خان کی بھتیجی ذراتن گئی تھیں تاہم اس نے کہنا شروع کیا۔

”جونگل سائیں۔۔۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ دھاڑیل (ڈاکو) احسان مھلگری اور اس کے گروہ کا قلع قمع کرنے کے لیے اعلیٰ احکام نے مجھے ذمہ داری سونپی تھی مگر میں نے مصلحتاً خود کو اس ذمہ داری سے بچا لیا تھا اگرچہ بعد میں میری نوکری بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ مگر اب مسئلہ یہ ہے کہ وہی ذمہ داری میرے داماد سکندر علی کو سونپ دی گئی ہے، وہ جوان ہے اور نووارد ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حکمہ نے اتنی بڑی ذمہ داری اسے اتنی آسانی سے کیوں سونپ دی۔۔۔ دراصل وہ خود بھی ذرا جو شلا سا ہے۔۔۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں۔۔۔ آپ مہربانی فرما کر ذرا مھلگری کو انڈر گراؤنڈ کر دیں کچھ وقت کے لیے۔۔۔ تب تک میں اپنے داماد کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کروں گا۔“

ڈی ایس پی سجاگو خان نے اپنی بات ختم کی تو وڈیرا جونگل خان کے چہرے پر اس کی بات سے ایک تناؤ سا آتا چلا گیا پھر بتدریج اس کا چہرہ پرسکون ہونے لگا تب اس نے پر خیال انداز میں ایک لمبی ”ہوں۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔“ کی آواز منہ سے نکالی۔

نجانے کیوں سجاگو خان نے اس کی اس لمبی ”ہوں“ میں سنسنی سی محسوس کی وہ بغور جونگل خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔۔۔ فضاء میں ایک لمحے کو تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

چند لمحے اعصاب شکن خاموشی کے بعد جونگل کھر کھراتی آواز میں بولا۔

”اڑے بابا۔۔۔ ڈی ایس پی صاحب۔۔۔ آپ نے تو سیدھے سیدھے

میرا تعلق بدنام زمانہ دھاڑیل مھلگری سے جوڑ دیا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں سائیں یہ بات نہیں ہے۔“ سجاگو خان فوراً بات ہٹانے

کی غرض سے بولا۔

”در اصل آپ علاقے کے بااثر شخص ہیں۔۔۔ سارے تر (اندرونی

علاقے) میں آپ کی پہچان اور شان ہے۔۔۔ آپ کا کہنا لانے کی بھلائی کو جرات ہوگی، ایک اطلاع کے مطابق مھلگری اسی علاقے کا رہواسی (رہنے والا) ہے تو۔۔۔“

”ہالا بابا ہالا۔۔۔ میں سمجھ گیا۔۔۔ تم بے فکر رہو۔“ وڈیرا جونگل اس کی بات

کاٹتے ہوئے بولا اور سجاگو خان جیسے کھل اٹھا۔

”بہت مہربانی۔۔۔ وڈیرا سائیں۔۔۔ بعض اوقات یاروں کے بچ ایسا

موڑ بھی آنے لگتا ہے کہ کچھ ذاتیات ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتی ہیں۔۔۔ میں بس سی صورت حال سے گھبراتا ہوں ذرا۔۔۔ سجاگو خان نے جیسے عذر پیش کیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ ڈی ایس پی۔۔۔ ہم بھی نہیں چاہتے کہ ہم لوگوں

کے بچ کوئی ایسا موڑ آئے۔۔۔ تم بے فکر رہو۔۔۔ ہماری بھی یہی کوشش ہوگی کہ ہماری دوستی کے بچ کوئی ایسا موڑ نہ آئے۔“

”بہت بہت شکریہ۔۔۔ سائیں۔۔۔ اب مجھے تسلی ہو گئی ہے۔“ سجاگو

خان قدرے خوش ہو کر بولا۔

”ویسے تمہارے داماد سکندر علی کے جگرے کو بھی داد دینی چاہیے جو احسان

مھلگری جیسے دھاڑیل سے ٹکرانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔“ وڈیرا جونگل آخر میں عجیب سے

لہجے میں بولا۔

☆.....☆.....☆

”کب تک آ جاؤ گے۔۔۔؟“ دہلی پتلی مگر قدرے نازک اندام رضیہ اپنے پولیس افسر شوہر سکندر علی کو حسب معمول پیٹی، پستول تھماتے ہوئے پوچھا۔

سکندر وردی پہن چکا تھا اور ناشتے وغیرہ سے بھی فارغ ہو چکا تھا، وہ ایک تیس پینتیس سالہ گھبر و جوان تھا، اس کی روشن آنکھوں میں کچھ کر دکھانے کی پر جوش انگلیں کڑوئیں لیتی محسوس ہو رہی تھیں، وہ دوسرے پولیس افسروں کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا وہ اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب محکمے نے جھلگہ کی گروہ کا قلع قمع کرنے کے لیے سکندر علی کا انتخاب کیا تو وہ بجائے دوسرے افسروں کی طرح اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے کے فوراً سر تسلیم خم ہو گیا۔ اگرچہ اس کے سر ڈی ایس پی سبھا گو خان نے اسے اس مہم پر جانے کے لیے باز رکھنا چاہا تھی کہ اس نے اس کی بھی سستی کی کہ حکام بالا تک سفارش پہنچا کر سکندر کو اس خطرناک مہم سے بچایا جائے مگر خود سکندر علی نے واشگاف انداز میں اپنے سر کو ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ سکندر علی خود بھی جانتا تھا کہ جھلگہ کی کتنا عیار اور خطرناک مجرم ہے، جو نہ صرف ڈپارٹمنٹ بلکہ صوبے کی پولیس اور انتظامیہ کے لیے ایک شرمناک چیلنج بن چکا تھا مگر اسے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا، اسے اس بات پر یقین کامل تھا کہ ایک جائز کام کے لیے خدا اس کی مدد ضرور کرے گا مگر اس کی بیوی رضیہ پریشان سی رہنے لگی تھی۔

وہ رضیہ سے پیٹی، پستول لیتے ہوئے بولا۔

”تو روز ایک ہی بات کیوں پوچھتی ہے، تجھے پتہ ہے کہ آج کل نہ میرے آنے کا کوئی وقت ہے اور نہ جانے کا۔۔۔“

چند لمحوں بعد وہ اپنی پیٹی، پستول اپنی کمر کے گرد باندھ چکا تو مزید بولا۔

”ویسے آج کل میں جھلگہ والے کیس میں کچھ زیادہ مصروف ہوں۔“

”سکندر! اپنا خیال رکھا کرو۔۔۔ جانے کیوں مجھے کبھی کبھی ہول سا آتا

”بس سائیں۔۔۔ نو جوان ہے نا۔۔۔ ابھی نا تجربے کا رہے۔۔۔ میں اسے دھیرے دھیرے سمجھا دوں گا۔“ سبھا گو خان نے فوراً جواب دیا۔

”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ تمہارا داماد بھی ہمارا بچہ ہے بابا۔۔۔ ویسے اسے یہ بھی سمجھا دینا کہ پولیس کی وردی پہن لینے سے کوئی تیس مار خان نہیں بن جاتا۔“ وڈیرا جو نکل خان معنی خیز لہجے میں بولا اور سبھا گو خان خاموش ہو رہا اگرچہ اسے یہ بات بری لگی تھی مگر وہ پی گیا تھا۔ تاہم اس کے دل کو اپ تسلی ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ڈاکو احسان جھلگہ کی کوس کی پشت پناہی حاصل تھی۔

احسان جھلگہ کی اس علاقے کا بدنام اور خطرناک ڈاکو تھا، اس نے ایک عرصے سے انتظامیہ کی ناک میں دم کر رکھا تھا، کئی پولیس افسروں نے اس کی اور اس کے گروہ کی سرکوبی کا بیڑا اٹھایا مگر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ اکثر تو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ڈی ایس پی سبھا گو خان کا داماد انسپٹر سکندر علی ایک نڈر اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا، اس نے پولیس کے محکمے میں سفارش کی بنیاد پر ترقی نہیں کی تھی۔ بلکہ اپنی بہادری اور دلیری کی بنیاد پر وہ اس مقام پر پہنچا تھا کہ حکام نے اس کی سابقہ کامیاب قیادت اور بہادرانہ صلاحیت و خدمات کو دیکھتے ہوئے اسے جھلگہ جیسے خطرناک ڈاکو جس کے سر کی قیمت لاکھوں روپے تک پہنچ چکی تھی، کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایک اینٹی ڈیکٹ فورس قائم کر کے اسے اس کا لیڈر منتخب کیا تھا مگر سبھا گو خان نہیں چاہتا تھا کہ اس کا جواں سالہ داماد اس خطرناک مہم میں اپنی جان کو خطرے میں ڈالے۔ وہ جانتا تھا کہ سکندر اس کی اکلوتی بیٹی رضیہ کا شوہر ہے اگر خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو اس کی اکلوتی اولاد رضیہ یہ غم سہہ نہیں سکے گی اور وہ اپنی بیٹی کو اتنے بڑے دکھ میں مبتلا دیکھ نہیں سکتا تھا۔

بہر حال وہ جب وڈیرا جو نکل کی حویلی سے واپس لوٹا تو خاصا مطمئن تھا۔

یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔

آج کی پارٹی خان محمد کی متنوع مزاجی اور تفریح طبع کا شاخسانہ تھی، وہ اکثر کبھی ”فیروزیل“، تو کبھی ”ویل کم“ اور کبھی ”گیٹ نوگیدر“ کے نام سے پارٹیاں دیتا رہتا تھا۔ ہوٹل میں رہنے والے طلباء و طالبات ہاسٹل کا باسی کھانا کھا کر بیزار ہو چکے تھے، ایسے میں یہ پارٹیاں انہیں نعمت غیر مترقبہ ہی لگتی تھیں، آج کی پارٹی میں دونوں بہن بھائیوں کے والدین نے بھی شرکت کی تھی۔ ویسے تو ان دونوں بہن بھائیوں سے دوستی کا خواہاں یونیورسٹی کا ہر شخص ہی تھا مگر ان دونوں کی زیادہ قربت اپنے کلاس میٹ گلایل اور لیلیٰ کے ساتھ تھی، وہ دونوں بھی آپس میں بہن بھائی تھے اور انہی کی طرح اعلیٰ اسٹیٹس رکھتے تھے، ان کی دوستی کی ایک اہم وجہ ان کے والدین کی آپس میں پرانی شناسائی تھی، سعید احتشام بابر جو ایک معروف بیوروکریٹ تھے، وہ وڈیرا جو نگل خان کے چند گنے چنے اور نہایت قریبی دوستوں میں سے تھے اور ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا، ان کی اس قرابت داری کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی کے چند من چلوں نے دبی دبی زبان میں انواہ پھیلائی شروع کر دی تھی کہ دونوں بہن بھائیوں کا جوڑا بہت جلد آپس میں رشتہ ازواج میں منک ہونے والا ہے بعض نے تو موجودہ پارٹی کو جس میں ان کے والدین بھی شریک تھے، اسی خاص مقصد کا غماز ٹھہرایا تھا۔

بہر طور پارٹی اپنے عروج پر تھی، اس چمکتے دکتے وسیع لان کے جس کنج میں جو جہاں بیٹھا تھا، وہاں ایک فائینوٹار ہوٹل کے پیرے مستعدی سے مہمانوں کو سرو کرنے میں مصروف تھے، ہر کوئی کھلے بندوں خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مصروف کار تھا، ایسے میں خان محمد بھی لیلیٰ کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا، اس نے ڈبل گھوڑا بوسکی پر اجرک اور سر پر سندھی ٹوپی جمائی ہوئی تھی۔

لیلیٰ نے بھی چکن کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے حسین

سراپے پر بہت دلکش لگ رہا تھا، میچنگ جیولری اور اسٹائلش براؤن بالوں کی بناوٹ نے اسے بلاشبہ آج کی پارٹی کی ”لیڈر ایونگ“ کا خطاب دے دیا تھا۔

”لیلیٰ! اب تو تمہارے پاس پڑھائی پوری کرنے کا بھی بہانہ نہ رہا، اب بتاؤ کیا ارادے ہیں تمہارے آئندہ کے۔۔۔“ خان محمد اسے مخاطب کرتے ہوئے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ڈوب کر بولا۔

اس کی بات سن کر لیلیٰ کے حنائی لبوں پر مسکراہٹ سی مچلی پھر جب وہ ایک خاص ادا سے اپنے خوبصورت بالوں کو جھٹک کر بولی تو خان محمد اس کے شہابی گالوں پر پڑنے والے گڑھوں کو دیکھ کر گھائیل سا ہونے لگا۔

”ابھی کہاں پڑھائی ختم ہوئی ہے۔۔۔ ابھی تو صرف ایم اے ہوا ہے۔“ دل آویز مسکراہٹ ہنوز اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ یوں تو پڑھائی میں عمر ہی نکلتی چلی جائے گی۔“ خان محمد قدرے جربز ہو کر بولا۔

”یہ پڑھائی وغیرہ تو شادی کے بعد بھی جاری رکھی جاسکتی ہے۔“
 ”نا بابا۔۔۔ نا۔۔۔ مجھے تم جیسے وڈیرے زادوں پر یقین نہیں۔۔۔ شادی کے بعد تو تم مجھے گھر میں ہی قید کر دو گے، پڑھائی تو دور کی بات ہے۔“ لیلیٰ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مصنوعی خوف سے بولی۔ تاہم اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ اسے چھیڑنے یا ستانے پر تلی ہوئی ہے اور خان محمد کی یہ حالت تھی کہ وہ بے قرار ہوا جارہا تھا، اس کے جواب سننے کے لیے۔۔۔ ابھی وہ مزید گفتگو جاری ہی رکھنا چاہتے تھے کہ کہیں سے ان کے من چلے دوستوں کا ٹولہ آپس میں ٹھٹھول کرتا ان کے قریب آ گیا اور مجبوراً انہیں ”گفتگو خاص“ کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

ادھر خان محمد کی بہن ماروی تقریب کی گہما گہمی سے اکتا کر اندر نشست گاہ میں ذرا سستانے کے لیے آ بیٹھی۔ کمرے کا اے سی آن تھا، بہت جلد اس کی تھکان

اتر گئی تو اس نے اسٹیریو ڈیک آن کر دیا اور اپنا پسندیدہ گیت سننے لگی۔

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے
ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری
سینے وچ آتش سائی ہے
یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے

اس دوران دروازے پر دستک ہوئی تو ماروی ڈیک ہلکا کر کے بلند آواز

میں بولی۔

”کون۔۔۔؟“

جواباً باہر سے مخصوص انداز میں کھٹکھٹانے کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے ماروی نے اٹھ کر فوراً دروازہ کھول دیا، حسب توقع شکیل کو وہاں پا کر مسکرا اٹھی۔۔۔ پھر اسے راستہ دیتے ہوئے بولی۔

”آ جاؤ۔۔۔۔۔“

”معافی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ اگر غل ہوا ہوں تو۔۔۔۔۔“ شکیل نے وجیہہ مسکراہٹ کے ساتھ دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔
”نہیں آؤ۔۔۔ بس ذرا باہر میرا دل دب سا گیا تھا، اس لیے اندر آ گئی تھی۔“ ماروی نے عذر پیش کیا۔

”حیرت ہے۔۔۔ تم اپنے بھائی خان محمد سے بالکل مختلف ہو۔۔۔ وہ تو اس قسم کی تفریح اور ہنگاموں سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔“ شکیل اندر آ کر ایک قریبی صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

”ضروری نہیں بہن بھائیوں کے مزاج ملتے ہوں۔“ وہ سرسری لہجے میں بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ آئندہ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے اب۔۔۔۔۔“

”ہم لوگوں کو سوچنے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔۔۔ ہم صرف حکم ماننے کے لیے ہوتے ہیں۔“ ماروی نے عجب لہجے میں جواب دیا۔ گانے کے بول اب بھی دور کہیں اس کے نہاں خانوں میں گونج رہے تھے۔

”حیرت ہے تم جیسی پڑھی لکھی لڑکیاں بھی ایسی دقیانوسی باتیں کرتی ہیں۔“ شکیل نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”اس میں دقیانوسی کی بات نہیں روایت کی بات ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایک تلخ روایت۔۔۔۔۔“ آخری جملہ اس نے بہم انداز میں کہا تھا۔

”ویسے تمہاری گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں یہ روایات پسند نہیں ہیں۔“

”پسند نہ پسند سے بھلا کیا ہوتا ہے۔“ ماروی کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

اس دوران وڈیا جونگل خان اور سعید احتشام آپس میں باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے، ان کے ہمراہ خان محمد اور لیلیٰ بھی تھے۔

”جونگل سائیں۔۔۔ آپ نے سیاست چھوڑ کر اپنے اوپر پھیکا پن طاری کر لیا ہے۔“ سعید احتشام ایک قریبی صوفے پر دھنستے ہوئے بولے اور اپنے سوٹ کی جیب سے بیش قیمت سگار نکال کر اسے سنہری میوزیکل لائٹس سے سلگایا۔

لیلیٰ اور شکیل بھی اپنے باپ کے قریب دائیں بائیں صوفے پر بیٹھ گئے تھے جونگل خان بھی سامنے والے صوفے پر اپنے دونوں بچوں خان محمد اور ماروی کے ساتھ براجمان ہوا اور قدرے بیزار سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”بابا۔۔۔ سیاست میں اب کچھ نہیں رکھا۔۔۔ آدمی بلاوجہ بدنامیاں ہی مول لیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس سے آدمی اپنے یارا حباب کو کھودیتا ہے اور ہم یاری باشی والے لوگ ہیں لہذا یاروں کو نہیں چھوڑ سکتے اس لیے سیاست چھوڑ

دی۔“ جو نگل خان اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور بات کا رخ پلٹتے ہوئے مزید اضافہ کیا
 ”اڑنے بابا۔۔۔ چھوڑ یہ سیاست کی باتیں۔۔۔ یہ بتاؤ گوٹھ کب آرہے
 ہو، بھابھی بچوں کو لے کر۔۔۔ یاد رہے پچھلے سال کتنا مزہ آیا تھا، چیکلم ہرن اور تگور
 کے شکار میں۔۔۔ آج کل تو پورے تھر میں مون سون کی بارشوں کی وجہ سے ہریالی ہی
 ہریالی ہے، میں تو کہتا ہوں ہمارے ساتھ ہی کل چلے چلو، ویسے بھی بچے امتحانوں سے
 فارغ ہو چکے ہیں۔“

”جو نگل سائیں۔۔۔ آپ کی مہمان نوازی کے تو دل سے قائل
 ہیں۔۔۔ جی تو ہمارا بڑا کرتا ہے کہ دوبارہ گوٹھ آئیں مگر کیا کریں آج کل پوری ملکی
 مشینری موجودہ حالات کی وجہ سے حرکت میں آئی ہوئی ہے اور ہمیں ہر دم الرٹ رہنا
 پڑتا ہے۔“ سعید احتشام دھیمے لہجے میں بولے اور سرگرم کو پھر اپنے ہونٹوں میں داب
 لیا۔

”ویسے یار تم نوکر شاہی کے بھی بڑے ٹھاٹھ ہوتے ہو، بھلے بڑے سے
 بڑے ادھر ادھر ہو جائیں، تم لوگوں کی کرسی کو کوئی نہیں ہلا سکتا۔“ جو نگل خان نے
 دوستانہ لہجے میں اپنی آنکھ دباتے ہوئے سعید احتشام سے کہا اور پھر کمرہ دونوں کے
 بھاری اور معنی خیز تہمتوں سے گونج اٹھا۔

”بہر حال احتشام صاحب آپ کو بچوں کے لیے وقت ضرور نکالنا پڑے گا
 یہ کچھ زیادہ ہی آوارہ ہوتے جا رہے ہیں، آخر ان کے بارے میں بھی کچھ سوچنا ہے
 ہمیں۔۔۔“ آخر میں جو نگل خان نے اپنے بیٹے خان محمد اور پھر لیلیٰ کی طرف دیکھتے
 ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

”ہاں۔۔۔ جو نگل سائیں آپ درست کہتے ہیں۔“ سعید احتشام اس کی
 تائید کرتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔

”ان کی پڑھائیاں تو چلتی رہیں گی، پہلے انہیں اپنے اپنے گھر کا کرنا چاہئے

ٹھیک ہے پھر ہم اگلے ہفتے کو پہنچ رہے ہیں، آج کل ویسے بھی بیگم صاحب کی طبیعت
 ذرا خراب رہنے لگی ہے بہر حال آپ بے فکر رہیں، ہم آئیں گے آپ کی طرف اور
 بات کہی کر کے ہی جائیں گے۔“

سعید احتشام نے حامی بھرتے ہوئے کہا اور خان محمد کا اشتیاق اس کے
 چہرے سے نمایاں ہو رہا تھا جبکہ ثلیل کن انکھیوں سے ماروی کی جانب دیکھ رہا تھا
 جہاں اسے سپاٹ سی خاموشی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

☆.....☆.....☆

تھر کے ریگستان میں دن بھی دیکھتے دیکھتے چڑھ جاتا ہے اور رات بھی جلدی
 اتر آتی ہے ماروی کو ہمیشہ اپنے گوٹھ کی سرزمین انساؤر کرتی تھی، وہ اکثر حیدر آباد والی
 کوٹھی ”تھمر ہاؤس“ سے جب بھی اپنے آبائی گوٹھ تھرا آتی تو وہ یونہی بے کراں صحرا کی
 وسعتوں میں گھومنے نکل جاتی۔

اس وقت بھی شام کے سائے ریگستان میں پر تو لے کھڑے تھے۔ ماروی
 صحرا کی وسعتوں میں اپنی نگاہیں جمائے اونٹ کی پیٹھ پر رکھے کجائے میں بیٹھی دور
 دور تک پھیلے ریگستان کو جیسے اپنے اندر جذب کر رہی تھی، ساربان ایک بوڑھا خاکستری
 چہرے والا شخص تھا جو اونٹ کی مہارت تھامے اپنی دھن میں مست، سرماری کا گیت الاپتا
 چلا جا رہا تھا، اس کی دیکھا دیکھی ماروی کے ہونٹوں میں بھی شاعری مچنے لگی اور اس پر
 رومانوی و بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

سینکڑوں سورج چمک اٹھیں اگر مل کر ایک ساتھ
 سال کی ساری چودھویں راتیں بن جائیں ایک رات
 بن ساجن کے قسم خدا کی، پھر بھی لگے اندھیرے
 میرا ساجن سب سے روشن ساجن کی کیا بات
 یہ شاعری گنگناتے ہوئے جانے کیوں ماروی کے چہرے پر ایسا کی اداسی

پھیل گئی۔ پھر ایک جگہ ماروی نے ساربان سے اونٹ رکوانے کو کہا اور اس کے بعد جب اونٹ نے اپنا پیٹ ریتلی زمین کے ساتھ لگا لیا تو ماروی اتر آئی، چہار سو ریت کا سمندر سا پھیلا ہوا تھا، ہولے ہولے چلنے والی ہوا میں بادموسم کی کاٹ سی تھی۔ اسے اپنے چہرے پر ہلکی سی تپش کا احساس ہونے لگا، ایک جانب اونٹوں کا قافلہ رواں دواں تھا اور ذرا پرے ایک ٹیلے کے عقب میں دکھتا ہوا سورج اپنی الوداعی کرنوں سے صحرا کی ریت کو چوم رہا تھا، ماروی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے اس پر کسی نے تنویری عمل کر دیا ہو، وہ میکا نیکی انداز میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی پھر ایک کیکر کے درخت کے پاس آ کر رک گئی، کیکر تلے بھی جھونپڑی کا ٹاٹ جو پردے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، ہولے ہولے پھڑ پھڑا رہا تھا، یہ جھونپڑی اسی نوجوان مجذوب سانول کی تھی جسے لوگ کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھ کر بھٹ سائیں کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ماروی ذرا قریب آئی تو اسے اندر سے ایک تاراجنجنے کی آواز کے ساتھ سانول کے گنگٹانے کی آواز سنائی دی، وہ وہیں گم صم ہو کر کھڑی ہو گئی، وہ اس کی آواز میں کھو گئی تھی۔

”جن کا تن تسبیح، من تسبیح کا دانہ ہوتا ہے اور دل یکتا را، ان کی طلب کی تاریخ وحدت کے سر پر بجتی ہیں۔۔۔ رگوں سے وحدۃ لا شریک لہ کا راگ سنائی دیتا ہے، جن کی نیندیں عبادت ہوتی ہیں، وہ سو کر بھی جاگتے رہتے ہیں۔“

(شاہ عبداللطیف)

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔“ ماروی سحر کی سی کیفیت میں ڈوبی جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئی، سامنے سانول اپنے جناؤں جیسے بالوں بھرا سر اٹھائے آنکھیں موندیں وجد کی سی کیفیت میں مستغرق تھا۔

پھر معاہی اس کی خوابیدہ مگر محتاط ساعتوں نے آہٹ پالی اور وہ کشف کی سی

کیفیت میں اپنی آنکھیں موندے ہی بولا۔

”آج میری جھونپڑی کی قسمت جاگتی ہے۔۔۔ میرا دل۔۔۔ میری ماروی آئی ہے۔“

اس کی بات میں نجانے کیا سحر تھی کہ ایک ایسی ماروی کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ دھیرے سے بولی۔

”سانول۔۔۔“

ماروی، سانول کو پکار کر اب خاموش کھڑی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور دور ریتلے ٹیلوں پر شام اتر آئی تھی۔

”ماروی تو یہاں نہ آیا کر۔۔۔ جودل میں رہتے ہیں انہیں کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ سانول چند ٹاپے کے بعد جذب کی سی کیفیت میں بولا۔

”میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ خاک نشین کی وجہ سے تجھ پہ کوئی حرف آئے۔“ سانول کی بات سن کر ماروی دو قدم آگے بڑھی اور قدرے رساں سے بولی۔

”سانول۔۔۔ مجھے بھول جا۔۔۔ نہ لگا یہ روگ خود کو۔۔۔ تو۔۔۔ جا اپنے گھر چلا جا۔۔۔ مت دے خود کو یوں آزار۔۔۔“

ماروی کی بات پر معا سانول نے بغور اس کی جانب دیکھا اور ماروی نے اس کی آنکھوں کی کشش کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا۔

”ماروی تجھے بھولنے کے لیے ہی تو میں یہاں اس ویرانے میں آ بیٹھا ہوں۔۔۔ مجھے خود کو آزار دے کر ہی لذت ملتی ہے۔۔۔ میری نارسائی کا عذاب ان تکلیفوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن میں کم ہمت یا بزدل بھی نہیں ہوں۔۔۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

”لیکن سانول۔۔۔ تو آخر کب تک یہ سب بھگتتا رہے گا۔۔۔“
اس کی بات سن کر سانول نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”ماروی۔۔۔ محبت دو جسموں کا نہیں۔۔۔ دو روحوں کا ملاپ ہوتی ہے کسی کو پالینا ہی محض محبت کی معراج نہیں۔۔۔ محبت پسینہ اور اخراج مانگتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ میں دے رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ موند لیں۔

ماروی کو اس کی باتیں عجیب بھی لگیں اور بھلی بھی۔۔۔ وہ حیران تھی کہ جو کچھ وہ یونیورسٹی میں قابل پروفیسرز کے پرمغز لیکچرز اور مستند نصابی کتابوں میں سنتی اور پڑھتی آئی تھی وہی کچھ اسے یہاں دور دراز ایک لق و دق ویران صحرا کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں حاصل ہو رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ سانول کو اس سے شدید قسم کی محبت ہے مگر کبھی اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ جذبہ کسی اظہار کا محتاج نہیں ہوتا اگر سچا اور پاکیزہ ہے تو محبت خود اپنی اثر پذیری سے دوسرے کے دل میں آگ بھڑکا دیتی ہے۔۔۔ اسی طرز انیسیت سے شاید ماروی کے اندر بھی آتش الفت بھڑکا دی تھی۔ حالانکہ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔۔۔ سانول ایک غریب ہاری کا بیٹا جبکہ ماروی گوٹھ کے بااثر وڈیرے جو نگل خان کی بیٹی تھی جس کی اوطاق میں سانول جیسے نجانے کتنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

ماروی کا شروع شروع میں سانول سے سامنا سرسری سے انداز میں ہوا تھا۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے ماروی نے اسے ایک عام ہاری سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی نو جوان سانول اسے گہری گہری نگاہوں سے آتے جاتے ضرور دیکھا کرتا تھا۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے اس لاابالی اور کھلنڈرے سانولے سلونے نو جوان کے

دل میں کیا سائی کہ ایک دن بیراگیوں کا ساحلیہ بنا کر ویرانے میں آن بسا اور دیوانہ مجذوب بن گیا۔۔۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے آخر ایک دن خود بخود ماروی پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ خاموش سادہ دیوانہ اسی کی چاہت میں گرفتار ہے اور پھر یہ بھی حقیقت ہی تھی کہ سانول جیسے غریب ہاری کے بیٹے کے اس عجیب و غریب اظہار محبت نے اس کے اندر بالکل بچا دی تھی اگرچہ اپنی اپنی جگہ ان دونوں کو اس تلخ حقیقت کا بھی اندازہ تھا کہ ان کی منزلیں تو کیا۔۔۔ راستے تک جدا تھے۔ ماروی اس دیوانے مجذوب کی جھونپڑی میں جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

رات اپنے جو بن پر تھی چٹکی ہوئی چاندنی نے پورے صحرا پر سحر طاری کر رکھا تھا۔۔۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔۔۔ ایسے میں قمری پتھروں والی حویلی کے تہہ خانے کے زینوں پر بھاری قدموں کی دھمک گونج رہی تھی۔۔۔ یہ وڈیرا جو نگل خان تھا جو اپنے مصاحب خاص منشی جبل کے ہمراہ تہہ خانے میں اتر رہا تھا۔۔۔ فرش پر قدم رکھتے ہی ایک سلاخ دار دروازے کے ذریعے وہ اندر کی جانب آ گئے۔

اب وہ ایک نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تنگ سی گلی میں کھڑے تھے، ان کے دائیں بائیں قطار در قطار سیلن زدہ سی تنگ و تاریک کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور جن کے دروازے جیل کے قید خانوں جیسے بنے ہوئے تھے۔ وہاں بھی نیم تیرگی سی پھیلی ہوئی تھی۔

ان جیل نما کوٹھریوں کو دیکھ کر انسانیت شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ ان میں جوان حتیٰ کہ بوڑھے اور بچے بھی مقید تھے۔ ان سب کے چہرے ستے ہوئے اور آنکھیں سہمی ہوئی تھیں۔۔۔ وڈیرے کو دیکھتے ہی وہ سب کے سب اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال کر جوڑتے ہوئے داد فریاد کرنے لگے۔

”رحم۔۔۔ سائیں وڈا۔۔۔ ہم پر رحم کرو بھوتار سائیں۔۔۔“

”ماٹھ کرو بابا۔۔۔ ماٹھ کرو۔۔۔ نہیں تو چم (کھال) ادھیر ڈالوں گا سب کی۔۔۔“ جبل نے قریب کی دیوار پر ٹپکے کوڑے کو اتار کر ان سب قیدیوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا تو وہ سب بے چارے سہم کر خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے سراسیمگی ہو رہی تھی۔

اب سب بد نصیبوں سے زمینوں اور اینٹوں کے بھٹوں وغیرہ پر بیگاری جاتی تھی۔۔۔ ان سب۔۔۔ کو یہی بتایا گیا تھا کہ ان کے باپ دادا حویلی والوں کے قرضدار رہ چکے ہیں۔۔۔ جو اصل رقم تو ایک طرف سود تک کی رقم ابھی تک نہیں لوٹا پائے تھے۔۔۔ لہذا اس زمرے میں ان سب کو یہاں رکھا گیا تھا اور ان سب سے جبری مشقت لی جاتی تھی اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا تھا آئندہ نسلوں تک۔ ادھر وڈیرے نے جبل کو مخصوص اشارہ کیا۔۔۔ وہ تو جیسے اس اشارے کا ہی منتظر تھا۔ فوراً ایک کوٹھری کی جانب بڑھا جدھر جوان مرد اور عورتیں اور لڑکیاں قید تھیں۔

جبل سندھو اندر داخل ہو کر ایک دہلی پتلی مگر جوان لڑکی کو انتہائی سنگدلی سے گھسیٹ کر باہر نکال لایا جیسے قصائی مرغی کو پنجرے سے ذبح کرنے کے لیے نکالتا ہے۔۔۔ وہ بے چاری ڈری، سہمی لڑکی مارے خوف کے کپکپا رہی تھی اس کے سر پر دھری میلی چادر اب ڈھلک گئی تھی۔۔۔ اندر کوٹھری میں عورتوں کا واویلا سا جج گیا جبل نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہنر کو کوٹھری کے سلاخوں پر زور سے مارا اور شراب کی تیز آواز کے گونجتے ہی پورے تہ خانے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

پھر وہ وہاں سے جانے لگے تو چند قیدی وڈیرے جو نگل خان سے گڑگڑاتے ہوئے بولے۔

”سائیں بھوتار۔۔۔ رحم کرو۔۔۔ ہم گریبوں پر رحم کروں سائیں۔۔۔“

”اڑے بابا۔۔۔ تم لوگوں پر میں رحم ہی تو کر رہا ہوں۔“ بالآ خرو وڈیرے جو نگل خان نے دھاڑ کر کہا۔

”ورنہ تم پر جتنا قرض چڑھا ہوا ہے وہ کھاتا اگر میں پولیس کے سامنے کھول دوں تو وہ تمہیں تھانے لے جا کر بند کر دیں اور پولیس والوں۔۔۔ کا سلوک کیسا ہوتا ہے قیدیوں کے ساتھ۔۔۔ وہ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔ یہاں تو پھر بھی تم۔۔۔ عیش میں ہو۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کے عقب میں جبل انتہائی سفاکی کے ساتھ ڈری سہمی لڑکی کو جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

مشرقی افق سے جیسے ہی سورج کی پہلی کرن نے صحرا کی ریت پر لوٹ لگائی تو لاتعداد موتیوں کی مالائیں سی ریگستان میں بکھرتی چلی گئیں۔ دشت کی فضا میں مون سون بارشوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔۔۔ یہی وجہ تھی کہ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے صدیوں سے پیاسے اس صحرا کو سیراب کرنے والے تھے، اس خوشی کو ہر چہ ند پر بند نے محسوس کیا تھا اور اپنے اپنے اظہار کے انداز میں سرگرم بھی ہو گئے تھے۔

کہیں قریب ہی ایک چنیم ہرن نے طویل زقند بھری اور صحرا کی وسعتوں کو سرنگوں کرتا چلا گیا تو کہیں مور و جد میں آکر محو رقص ہو گئے۔

سرکنڈوں کی بنی جھوپڑیوں اور چند کچے مکانون سے ڈرا پرے، جوار، گوار اور گندم کی فصلیں لہلہا رہی تھیں جہاں بوسیدہ سی صدری (واسکٹ) اور لاک (تہبند) باندھے خاکستری پیٹھوں والے ہاری، گندم گاہنے والے بیلوں کو کھد پڑ رہے تھے اور چند ایک من چلے ٹولی کی صورت میں ایک چھتار کے درخت تلے اجرکوں کی کانج باندھے ہنسی ٹھٹھے میں مشغول تھے۔۔۔ کہیں قریب ہی کسی جبل بھٹ (ریتیلہ) سے نگرانی کسی چرواہے کی سرکوبھاری گنگٹانے کی آواز سنائی دے رہی تھی جو شاہ عبداللطیف کی تخلیق کردہ سرکوبھاری کو بڑے سر میں گارہا تھا۔

غرض تھر میں اس وقت مون سون کی بارشوں کی وجہ سے ہریالی ہی ہریالی پھیلی ہوئی تھی اور عرصے سے بوند بوند کو تر سے ہوئے باشندے مارے خوشی کے ناچ رہے تھے۔

ذرا دور صحرائی ٹیلوں کے ساتھ ایک مختصر سی راہ گزر پر سرخ رنگ کی لینڈ کروزر دوڑی چلی آ رہی تھی پھر چند اور موٹر مڑنے کے بعد وہ قمری پتھروں والی حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ حویلی کے دیوہیکل گیٹ پر موجود مسلح گارڈ نے گاڑی اور اس پر لگے سرکاری جھنڈوں کو لہراتے دیکھ کر فوراً بڑا سا گیٹ کھول دیا اور لینڈ کروزر اندر داخل ہو گئی۔ اندر وسیع احاطے میں حویلی کے کمین ان کے استقبال کے لیے اپنے چہروں پر مسکراہٹیں لیے کھڑے تھے، ان میں جونگل خان کی پوری فیملی اور دیگر خدمت گاروں کی قطاریں بھی مودب کھڑی تھیں پھر لینڈ کروزر کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے احتشام بابر اور بیگم احتشام اترے۔ اس کے بعد ٹکیل اور لیلیٰ بھی نیچے اتر آئے لیلیٰ کو دیکھتے ہی خان محمد کی آنکھیں چمکنے لگیں، البتہ ٹکیل اور ماروی نے غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

”بھلی کرے آئیو۔۔۔ بھلی کرے آئیو۔“ (خوش آمدید۔۔۔ خوش آمدید)

وڈیرا جونگل خان علاقے کے مخصوص استقبالی کلمات ادا کرتا ہوا اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے سعید احتشام کی طرف بڑھا اور پھر دونوں بڑی گرم جوشی سے بنگلیئر ہوئے پھر خان محمد اور ماروی نے بھی اپنے اپنے طور پر ٹکیل اور لیلیٰ کو خوش آمدید کہا اور پھر یہ سب لوگ اندر آ گئے۔

یہ ایک اونچی چھت والا بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں فضاء ایئر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک سے خنک ہو رہی تھی۔ وہاں موجود صوفوں پر یہ سب لوگ براجمان ہو گئے۔۔۔ وہاں صوفے کے علاوہ بڑے بڑے گول منقش پائے والی ہالا کی چار پائیاں اور موٹے بھی بچھے ہوئے تھے جن پر حویلی کے چند مصاحب خاص بیٹھ گئے تھے۔

ابھی یہ لوگ رسماً گفتگو میں مصروف تھے کہ اچانک جبل اندر داخل ہوا وہ خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا اس نے قریب آ کر وڈیرا جونگل خان کے کان میں کچھ کہا اور اگلے ہی لمحے جونگل خان چونک پڑا پھر مہمانوں سے معذرت کرتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا جبل اسکے عقب میں تھا۔

”اڑے بابا۔۔۔ بتاتا کیوں نہیں ہے تو۔۔۔ جھلگڑی اس وقت یہاں کیا کرنے آیا ہے۔“ جونگل خان نے چلتے چلتے جبل سے پوچھا۔ وہ اب جواب دینے کے لیے اس کے قریب آ گیا تھا۔

”س۔۔۔ س۔۔۔ وہ۔۔۔ زخمی ہے کہتا ہے پولیس مقابلہ ہوا ہے۔“

”اڑے تو اسے پھر ادھر آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ بے وقت ٹپک پڑا ہے۔ پتہ ہے میرے ہاں بڑے بڑے افسروں کا آنا جانا رہتا ہے۔“ جونگل خان کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔۔۔ جبل ہاتھ جوڑے خاموش کھڑا تھا۔

”وہ جنگل ڈیرے کے اوطارے (اوطاق) میں ہی ہے نا۔۔۔“ جونگل خان نے تصدیق چاہتے ہوئے جبل سے پوچھا۔

”ہاؤ سائیں۔۔۔ بھلا میں چریا تھوڑے ہی ہوں کہ اسے یہاں لے آتا۔۔۔“ زخمی جبل نے اپنے نمبر بڑھانے کی کوشش کی اور پھر یہ لوگ گھوڑیوں پر سوار ہو کر ایک ایسی جگہ آ پہنچے جو ایک بڑے احاطے پر مشتمل تھی۔ بادی انظر میں یہ جگہ بوسیدہ سا فارم نما اوطاق نظر آتی تھی جس کی عمارت مٹی گارے سے بنائی گئی تھی جونگل خان گھوڑی سے اتر کر غراب سے سیدھا کوٹھری میں داخل ہو گیا جہاں کیروسین کی روشنی میں ایک خاصے گھٹے ہوئے جسم کا مالک شخص چار پائی پر نیم دراز تھا۔ اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ زخمی تھا۔ اس نے سیاہ شلوار قمیض اور اجرک کا ڈھانٹا باندھا ہوا تھا۔ جواب اس کے چہرے سے پھسل کر گردن میں ڈھلک آیا تھا اور اس کا چہرہ واضح ہو گیا تھا۔ چہرے سے ہی وہ ایک سفاک شخص دکھائی دے رہا تھا۔

یہی شہرت یافتہ ڈاکو احسان چھلگری تھا جس کے سر کی قیمت لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ وڈیرا جونگل خان کی اسے پشت پناہی حاصل تھی اور جونگل خان درپردہ اس سے بہت اہم کام لیتا تھا۔ جونگل خان کو اندر آتے دیکھ کر وہ آہستگی کے ساتھ اٹھنے لگا مگر جونگل خان نے اسے اشارے سے لیٹے رہنے کو کہا اور خود قریب پڑے ایک موٹے کوکھنچ کر اس پر بیٹھ گیا اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

”اڑے چھلگری۔۔۔ یہ کیا ہوا تیرے ساتھ۔۔۔ کون مائی کا لعل ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے تجھے پھٹی (زخمی) کر ڈالا۔۔۔“ جونگل خان چھلگری کو مخاطب کرتے ہوئے کھرکراتی آواز میں بولا۔۔۔ اس کا لہجہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

”وڈاسائیں۔۔۔ کبھی گھات تو کبھی مات۔۔۔ یہ تو ہماری حیاتی کا حصہ ہے۔۔۔“ چھلگری مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”تھا کوئی بڑا جی دار قسم کا پولیس آفیسر۔۔۔ شاید سکندر علی نام تھا اس کا۔۔۔ یہ اسی کا تھنہ ہے۔“ اتنا کہہ کر چھلگری چپ ہو گیا۔۔۔ وہ ذرا ہانپنے لگا۔

”اڑے منشی، حکیم بڈھل کو بلا لا جلدی جا۔۔۔ بھاگ۔۔۔“ جونگل خان نے باہر کھڑے جبل سے کہا۔ تو چھلگری فوراً منع کرتے ہوئے بولا۔

”ناسائیں۔۔۔ کوئی لوڑ، تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ نوا ایم ایم کی گولیوں کا برسٹ جیسے آیا تھا ویسے ہی گوشت پھاڑتا ہوا پار بھی ہو گیا تھا بس حیاتی تھی ورنہ میں بھی پار ہی ہو جاتا۔“ چھلگری گرد سے اٹے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا تھا۔

جونگل خان۔۔۔ سکندر علی کے نام پر ذرا چونکا تھا۔ اس نے یونہی وضاحت سے پوچھا۔

”چھلگری۔۔۔ یہ سکندر علی وہی نو جوان پولیس افسر تو نہیں جو اینٹی ڈکیت فورس کا لیڈر ہے۔ ڈی ایس پی سبھا گو خان کا داماد۔۔۔“

”ہاؤ سائیں۔۔۔ وہی تھا۔۔۔“ چھلگری نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ویسے سائیں۔۔۔ تھا بڑا جی دار نو جوان آخری سانس تک لڑتا رہا تھا۔“

”تو کیا وہ مر گیا۔۔۔!!“ جونگل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”چھلگری یار۔۔۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔۔۔“

”کیا اچھا نہیں ہوا سائیں وڈا۔۔۔“ چھلگری کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”یار! سی پولیس افسر۔۔۔ سکندر کی تو میں تجھ سے خیر مانگنے آیا تھا۔“ جونگل خان نے کہا۔

”سائیں وڈا اب خیر کیسی۔۔۔ جب وہ خود ہی نارہا تو۔۔۔“ چھلگری قدرے سفاکی سے بولا اور پھر پوچھا۔

”سائیں وڈا۔۔۔ آخر کیا بات ہے؟ سکندر علی کے بارے میں آپ کچھ زیادہ فکر مند نظر آ رہے ہیں۔“

تب جونگل خان نے اسے اپنے اور ڈی ایس پی سبھا گو خان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔

”سائیں یہ تو واقعی غلط ہو گیا۔“ چھلگری سنجیدگی سے بولا۔

”غلطی میری تھی۔۔۔ کہ میں نے تجھے بتانے میں دیر کر دی تھی۔“ جونگل خان نے کہا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے جو ہو گا میں دیکھ لوں گا۔۔۔ تو ایسا کر یہاں ذرا سستالے اور ذرا خیال رکھا کر آج کل میرے ہاں سرکاری افسروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تو ذرا مجھ سے دور رہ۔ میں نہیں چاہتا کسی کو موقع دوں کیونکہ جب سے میں نے سیاست چھوڑ دی ہے خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا ہوں۔“

جونگل خان کے لہجے میں پچھتاوے کی جھلک تھی اور چھلگری پر خیال انداز میں اپنا سر ہلانے لگا۔

جب تک سکندر باہر رہتا تھا رضیہ کو عجیب و غریب دوسے گھیرے رکھتے تھے اس وقت بھی جبکہ شام کے سائے دیوار پر اترنے لگے تو رضیہ کا جی ہولنے لگا۔ سکندر کا ہنوز کہیں پتہ نہ تھا اور وقت ہوتا تو وہ اتنی پریشان نہ ہوتی مگر جب اسے پولیس پارٹی کا لیڈر بنا کر ایک بدنام اور خطرناک ڈاکو احسان جھلگري کے گروہ کا قلع قمع کرنے کی ذمہ داری پولیس محکمے نے سونپی تھی تب سے رضیہ کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگی تھی۔

سکندر علی آج پھر علی الصباح ہی نکل پڑا تھا گھر سے۔۔۔ اور رضیہ دعاؤں کے سائبان تلے اپنے شوہر کو رخصت کر کے خود تصویر انتظار بن گئی۔

معاہرہ کی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز ابھری اور پھر بند ہو گئی۔۔۔ رضیہ کا دل جانے کیوں یکبارگی زور سے دھڑکا۔ پھر ایک ساتھ کئی بھاری بوٹوں کی آواز گونجی۔ رضیہ کے دل نے کلمہ خیر کی گردان شروع کر دی تھی۔ ایک ایک پھر اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اندر ایک چھنا کا ہونے والا ہے اس کے وجدان نے اس پر آگہی کے دروازے وا کرنے شروع کر دیئے تھے اور جب کال بیل زور سے بجی تو اسے اپنے کنپیٹوں پر سننا ہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

ملازمہ نے جب دروازہ کھولا تو وہ ایک چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ رضیہ پرتو جیسے سکتہ طاری ہونا شروع ہو چکا تھا اس کی نگاہیں کھلے دروازے کے پار پولیس کے آدمیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جنہوں نے اپنے کاندھے پر میت اٹھا رکھی تھی اور وہ اپنے مغموم چہروں کے ساتھ اندر داخل ہو چکے تھے پھر انہوں نے گہوارے کو محسن کے وسط میں رکھ دیا۔ گہوارے میں رضیہ کے شوہر اور جواں سال نڈر پولیس افسر سکندر علی کا جسد خاکی وردی میں ملفوف گہرے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک اور گاڑی آندھی ظوفان کے ساتھ وہاں آن رکی اس میں سے ڈی ایس پی سبھا گو خان اتر رہا تھا اسے شاید اپنے داماد کی المناک موت کی اطلاع مل چکی تھی۔

ڈی ایس پی سبھا گو خان کی حالت اس وقت زخمی سانپ کی سی ہو رہی تھی وہ بار بار اپنی مٹھیوں کو یوں بچھنچھ رہا تھا جیسے اس میں ڈاکو احسان جھلگري کی گردن دبی ہو وہ وڈیرا جو نگل خان سے بھی سخت خائف ہو چکا تھا۔۔۔ جس نے دوست بن کر اسے اتنا بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ اس وقت اپنے سرکاری بیگلے میں موجود تھا۔ اس کے سامنے اس کی جواں سالہ بیٹی زندہ لاش کی مثل گم صم بیٹھی ہوئی تھی جس نے بیوگی کا غم اپنے جوان کندھوں پر لیا تھا بے چاری کے ہاتھوں کی حتا بھی ابھی ماند نہ ہوئی تھی کہ تقدیر نے اس کا سہاگ اجاڑ دیا تھا وہ یوں چپ اور خاموش بیٹھی تھی جیسے اپنے شوہر سکندر کی آہٹ کی منتظر ہو۔

سبھا گو خان اپنی جواں معصوم بیٹی کی حالت پر بری طرح کڑھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ جھلگري کو وڈیرا جو نگل خان کی پشت پناہی حاصل ہے اور وہ بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ خود جو نگل خان نے بعض حالات میں سبھا گو خان کی مدد کی تھی اور کرتا رہتا تھا۔ جن میں پروموشن اور اس سلسلے کے کئی کام جو نگل خان نے چٹکی بجاتے انجام دیئے تھے جوا بیا سبھا گو خان بھی وڈیرے جو نگل خان کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالتا رہا تھا مگر اب اس کی اپنی رضیہ بیوہ ہو کر زندہ درگور ہو چکی تھی اور جو نگل خان کی یہ دوستی ذاتی مخالفت میں بدل گئی تھی وہ جو نگل خان کی کئی مکروہ سرگرمیوں سے واقف تھا جن میں اس کی نجی جیلوں اور اس طرح کے کئی دوسرے کارنامے شامل تھے۔

شاید قدرت نے ظلم کا ساتھ دینے کی پاداش میں سبھا گو خان کو مکافات عمل سے گزارا تھا۔ اس کا کل سرمایہ حیات اس کی اکلوتی بیٹی رضیہ ہی تھی۔ جسے نوجوانی میں بیوہ دیکھ کر وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ موبائل پر وڈیرے جو نگل خان کا نمبر ملانے لگا۔ اس کے سانسوں کا تموج بے انتہا غصے کی غمازی کر رہا تھا۔

نہیں بنے گی۔۔۔“

”بابا۔۔۔ تم نے جھلگری۔۔۔ جھلگری کی رٹ تو ایسے لگا رکھی ہے جیسے وہ میری جیب میں ہو۔۔۔“ دوسری جانب جونگل خان کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔
”چنگا بابا ٹھیک ہے۔۔۔ جوتی میں آئے کرتے پھرو۔۔۔“ یہ کہہ کر جونگل خان نے موبائل آف کر دیا اور سبھاگو نے اپنا موبائل قریبی صوفے پر عالم طیش میں اچھال دیا۔

☆.....☆.....☆

”خیر تو ہے جونگل سائیں۔۔۔ کس سے بات کر رہے تھے فون پر۔۔۔ سعید احتشام باہر نے وڈیرے جونگل خان کو غصے میں موبائل سامنے میز پر بیٹھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔
”تھا کوئی۔۔۔ یونہی خواہ مخواہ گلے پڑ رہا تھا۔۔۔“ جونگل خان ٹالتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں اس وقت تنہا حویلی میں اپنے کمرہ خاص میں بیٹھے شراب سے شغل کر رہے تھے سامنے ٹیبل پر ولاجی و سکی کی بوتلیں اور خوبصورت بلوریں پیگ رکھے ہوئے تھے ساتھ میں سوڈے کی بوتل اور آئس کیوبس بھی میز پر دھری تھی۔۔۔ وہ دونوں ہلکی ہلکی چسکیوں کے درمیان نمکوبھی گا رہے کھا رہے تھے۔
”یار ایک کام کرو۔۔۔ احتشام!“ طویل خاموشی کے بعد وڈیرا جونگل خان نے اچانک اپنے سامنے بیٹھے سعید احتشام سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں کہو۔۔۔“ سعید احتشام باہر ہونٹوں سے پیگ لگاتے ہوئے بولا۔

”یار وہ ڈی ایس پی ہے نا۔۔۔ سبھاگو خان۔۔۔ اس کی بدلی کرا دو۔۔۔ کہیں دوسری جگہ۔۔۔ بلکہ ڈسٹرکٹ آؤٹ کروادو اسے۔۔۔“ جونگل خان اپنا

”ہالو بابا۔۔۔ رئیس جونگل خان بول رہا ہوں۔“ چند ثانیوں بعد موبائل پہ جونگل خان کی مخصوص آواز ابھری اور سبھاگو خان اپنی کیکپاٹ اور پھنکارتی ہوئی سانسوں پر قاپو پانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا۔
”جونگل خان۔۔۔! یہ اچھا نہیں ہوا۔۔۔“ غم و غصے کی شدت میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”بابا۔۔۔ سبھاگو صاحب۔۔۔ تم کو کاوڑ (غصہ) کرنے کا پورا حق ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اچانک اور لاعلمی میں ہوا۔“ جونگل خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”جونگل خان! مجھے جھلگری چاہیے بس۔۔۔“ سبھاگو خان لفظ چپا چپا کر بولا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شدید برداشت کی کیفیت سے دوچار تھا اس وقت پہلا موقع تھا کہ وہ جونگل خان سے اس طرح مخاطب ہوا تھا۔
”بابا۔۔۔ مے آکھیا تا تم کو گلا کرنے کا حق ہے۔“ جونگل خان سپاٹ لہجے میں بولا۔

”بابا۔۔۔ تم کو اس کا سردھان (قصاص) ملے گا۔“
”مجھے سردھان نہیں صرف سرچاہیے۔۔۔ جھلگری کا سر۔۔۔“ سبھاگو خان دانت پیٹتے ہوئے بولا۔

”نا بابا۔۔۔ اس طرح تو بات نہیں بنے گی پھر۔۔۔“
دوسری جانب سے جونگل خان کو بھی تاؤ آ گیا تھا لیکن اب سبھاگو خان کو اس کی پروا نہیں رہی تھی وہ اس سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

”بات اب رہی کہاں ہے جو بنے گی۔۔۔“
”جونگل خان میرا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہے۔۔۔ اگر چاہتے ہو کہ ہماری دوستی قائم رہے تو جھلگری کو فوراً میرے حوالے کر دو۔۔۔ اس سے کم پر بات

پگ خالی کرتے ہوئے بولا۔

سعید احتشام جونگل خان کی بات سن کر ذرا چونکا پھر کچھ یاد کرتے ہوئے

بولا۔

”یہ ڈی ایس پی سبھاگو خان۔۔۔ وہی ہے جس کا داماد سکندر علی بدنام ڈاکو جھلگری کا مقابلہ کرتے ہوئے جاں بحق ہوا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہی ہے یہ۔۔۔“ جونگل خان قدرے بیزار سے بولا اور سعید احتشام بابر پر خیال انداز میں اپنا سر ہلانے لگا۔

☆.....☆.....☆

”یہ کپھر ہے۔“ خان محمد نے ایک جالی دار اور خاصے بڑے چوہی بکسے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قریب میں گھبرائی ہوئی لیلیٰ سے کہا۔۔۔ مذکورہ بکسے میں مضبوط لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں جہاں ایک انتہائی خوفناک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

اس وقت دور دراز تیلے افق پر سورج اپنی نارنجی روشنی سے لہو و دق صحرا میں موتی سے نکھیر رہا تھا۔۔۔ خان محمد موقع ملنے ہی لیلیٰ کو صحرا کی سیر کراتے ہوئے اپنے سانپوں کے فارم میں لے آیا تھا جہاں ایک بڑے سے احاطے میں ایک تاریک سی کوٹھری سی بنی ہوئی تھی اور باہر ان گنت چھوٹے بڑے ان گنت لوہے کی جالی سے بنے ہوئے بکسے رکھے ہوئے تھے اور ان بکسوں میں انواع و اقسام کے سیاہ چستکبرے، چتری اور بزر دھاری دار سانپ کنڈلیاں مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی نے تو بڑے خوفناک انداز میں اپنے پھن بھی کاڑھ رکھے تھے جن کی ”سوں۔۔۔ سوں“ کرتی پھنکاروں سے فارم دہشت ناک انداز میں گونج رہا تھا لیلیٰ اس صورتحال سے کافی خوفزدہ اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

وہ قدرے سہم کر خان محمد سے بولی۔ ”خان محمد! چلو واپس یہاں سے۔ مجھے

نجانے کیوں وحشت سی ہو رہی ہے۔ تمہارا بھی عجیب شوق ہے یہ۔۔۔“ اس کی بات سن کر خان محمد نے ایک قہقہہ لگایا جیسے اسے اپنے شوق سے فخر ہوا ہو۔ وہ بولا۔

”ایک تو تم شہری لوگ ڈرپوک بہت ہوتے ہو۔۔۔ ہمارے یہاں گوٹھ کی عورتیں تو ان سانپوں کو اپنے گلے کا ہار بنا کر جھلاتی پھرتی ہیں۔۔۔“ چند ٹاپے توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ”آؤ تمہیں اور دوسرے سانپ بھی دکھاؤں۔۔۔ ان سے ڈر و مت یہ سب میرے دوست ہیں۔“

پھر اس نے قریب کھڑے چند گیر وے رنگ کے کپڑے پہنے خاکستری رنگت والے جو گیوں کو کوئی اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا لیلیٰ کو بھی مجبوراً اس کے ساتھ چلنا پڑا اسے یہ جگہ تو کیا پورا گوٹھ ہی نہیں بھایا تھا اگرچہ اس وقت بارشوں کی وجہ سے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی اسے یہ جگہ بہت پسند آئی اور بے رونق سی دکھائی دی تھی۔

”یہ پدم ہے۔۔۔ اور یہ دمن۔۔۔“ خان محمد اپنی دھن میں مست اور سانپوں کے نام لیلیٰ کو بتاتے ہوئے اندر کوٹھری میں آ گیا تھا جدھر بڑے بڑے خوفناک قسم کے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے تھے بعض سانپ تو چوہی دستوں کی چھتوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر لیلیٰ ایک لمحے کو دہل گئی تھی مگر خان محمد ان سب کے نام گنوا کر فخر محسوس کر رہا تھا۔

”اور یہ باڈھو اور کاریہر ہے۔۔۔ اس کے ڈستے ہی انسان دوسرا سانس نہیں لے سکتا اور یہ سنگ چور ہے۔۔۔ یہ ڈستہ ہے تو انسان کا جسم پانی بن کر بہہ جاتا ہے۔۔۔ یہ سب یہاں کی بڑی خطرناک بلائیں ہیں۔۔۔ جو عموماً بارشوں کے موسموں میں نکلتی ہیں۔“

اسی دوران قریب کھڑے ایک جوگی نے ایک سانپ خان محمد کے گلے میں ڈال دیا یہ دیکھ کر لیلیٰ دہشت زدہ ہو گئی اور وہ حیرت و خوف سے طے جلے تاثرات سے

خان محمد کو بکنے لگی جو بڑے اطمینان سے سانپ کو اپنے گلے کی مالا بنائے مسکرا رہا تھا پھر جانے ایسا کیسی اس کے جی میں کیا سائی کہ وہ سفید چتری سانپ اپنے گلے سے اتار کر لیلیٰ کے اوپر اچھال دیا جس نے لیلیٰ کے اوپر گرتے ہی فوراً اس کی صراحی دار گردن سے لپٹ کر اس کے چہرے کے آگے اپنا بڑا سا پھن کاڑھ لیا اور لیلیٰ خوفزدہ سی کھڑی رہ گئی اس کی خوبصورت آنکھیں پھیل چکی تھیں اور گلابی بھرے بھرے ہونٹ دائرے کی صورت میں وا ہو گئے تھے اس کی گھگی بندھ گئی تھی سانپ اپنی چھوٹی مگر خوفناک آنکھوں سے لیلیٰ کو تنکے جارہا تھا۔

”خ۔۔۔ خان۔۔۔ محمد۔۔۔!“ مارے خوف و دہشت کے لیلیٰ کی زبان سے الفاظ پھسلے مگر خان محمد اطمینان سے کھڑا اس کی جانب دیکھ کر مسکراتا رہا۔۔۔ پھر بولا۔

”ڈرو نہیں تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔۔۔“

مگر اسی لمحے لیلیٰ کو پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور سر چکرانے لگا اگلے ہی لمحے وہ زمین پر ڈھیر ہو چکی تھی اس کے زمین بوس ہوتے ہی سانپ اس کی گردن سے علیحدہ ہو کر ایک جانب کوریک گیا۔ اس صورتحال نے خان محمد کو ذرا بوکھلادیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ لیلیٰ کے گزار جسم کو بے سدھ پڑا دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرانے لگا۔

لیلیٰ کی جب آنکھ کھلی تو وہ دہل گئی۔ وہ ایک نیم تاریک اور بوسیدہ سی کونھری میں کھتری چار پائی پر پڑی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ تھراٹھی۔۔۔ اس نے اپنے اوپر خان محمد کو جھکے پایا۔۔۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہوا تھا۔۔۔ لیلیٰ کو یوں لگا جیسے اس کے سینے پر کوئی خوفناک ناگ پھن کاڑھ بیٹھا ہو اور کسی بھی لمحے اسے ڈس لینا چاہتا ہو۔۔۔ وہ خوفزدہ سی نظروں میں خان محمد کو دیکھنے لگی۔

”لیلیٰ۔۔۔ اتم مولا کی تم بہت حسین ہو۔۔۔ بہت زیادہ

خوبصورت۔۔۔“ خان محمد جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر بولا یہی وہ وقت تھا جب لیلیٰ کو اپنے بدن میں چوہنیاں رنگتی محسوس ہوئیں اور اپنے تحفظ کا خیال خوف پر غالب آ گیا اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور خان محمد کو ذرا پرے دھکیل دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی وہ اب کافی سنہیل چکی تھی مگر اس کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”خان محمد۔۔۔! یہ کیا حرکت تھی۔۔۔ چلو یہاں سے۔۔۔“ خان محمد بھی خاصا سنہیل چکا تھا۔۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نیند سے بیدار ہوا ہو تاہم اس کے چہرے پر قدرے ندامت کے آثار نمایاں تھے اور پھر لیلیٰ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اس نے ہولے سے ”سوری“ کہا پھر وہ اسے واپس حویلی میں لے آیا۔

ماروی کے لیے اپنے گونڈ کے یہ خوبصورت صحرائی مناظر نئے تھے مگر وہ جب بھی اپنے گونڈ آئی تو ان مناظر میں کھوی جاتی تھی آج تو اس کا کلاس فیلو نکیل بھی ہمراہ تھا۔۔۔ وہ دونوں ہی ان مناظر میں کھوئے کھوئے کافی آگے نکل آئے تھے چہار سوتی وق صحرا پھیلا ہوا تھا۔ نکیل بھی اس ماحول سے کافی انسپار ہو رہا تھا۔

ماروی نے روایتی مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا اس مخصوص تھری عورتوں والے لباس میں وہ خاصی سچ رہی تھی۔ یہ لباس وہ کبھی کبھار پہنتی تھی نکیل کو بھی ماروی اس روایتی لباس میں بہت بھلی اور منفرد سی نظر آ رہی تھی۔

پہلی چیز یا، چمکتا ہوا گھاگھرا شوخ رنگ کی چولی میں اس کے حسن کی سادگی ایک عجیب سی کشش پیدا کر رہی تھی کانوں میں چاندی کے بالے ماتھے پر جھالر چھکنے والے بالکل ایک خوبصورت اور ثقافتی نمونہ بنادیا تھا انگلیوں میں بے شمار گھنگھروؤں والے چھلے اور صراحی دار گردن میں چاندی کی موٹی سی مفسلی بھی اس کے منفرد حسن میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

وہ دونوں اس وقت ڈھلتے سورج کی سنہری کرنوں میں مفلوف ایک ریتیلے ٹیلے پر کھڑے تھے۔

”ماروی۔۔۔ تمہارا گاؤں واقعی بہت خوبصورت ہے بالکل افسانوی سا۔“ کھیل ایک خوش کن تبصرہ کرتے ہوئے ماروی سے مخاطب ہوا جو ماروی کو بھلا لگا مگر پھر کھیل نے محسوس کیا جیسے ماروی ایک دم سنجیدہ اور اداس سی ہو گئی ہے اور پھر وہ اداسی سے بولی۔

”کھیل یہاں زندگی باہر سے جتنی خوبصورت لگتی ہے اندر سے اتنی ہی دکھی ہے۔۔۔ ہم انٹر کنڈیشن گاڑیوں کے اندر بیٹھ کر اس گاؤں کی سیر کو نکلیں تو یہ ہمیں اچھا لگے گا مگر جب یہاں تنگ و تاریک گویوں اور کھریل کی چھتوں والے بوسیدہ سے مکانات (جھونپڑیوں) میں اپنے شب و روز گزاریں تو ہمیں صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ یہاں کی زندگی کتنی کٹھن اور تکلیف دہ ہے یہاں کے لوگ پانی جیسی بنیادی ضرورت تک سے اکثر محروم ہیں۔“

اتنا کہہ کر ماروی خاموش ہو گئی پھر اچانک اسے بوجھل پن کا احساس ہوا اور پھر لہجے میں کھٹک پیدا کرتے ہوئے بولی۔

”آؤ۔۔۔ معاف کرنا تم پہلی دفعہ یہاں آئے ہو۔۔۔ بجائے جنہیں اس ماحول سے لطف اندوز کرنے کے۔۔۔ بور کر رہی ہوں۔۔۔ پھر وہ دونوں ٹیکری سے اترنے لگے تو ایک طرف بیل گاڑی چلی جا رہی تھی اور گاڑی بان اپنی دھن میں مگن شاہ لطیف کی تخلیق کردہ سرکوحیاری گاٹا ہوا جا رہا تھا اور ذرا پرے اونٹوں کا قافلہ بھی انہیں گزرتا دکھائی دیا۔ جس کے خاکستری پیٹھوں والے دبے پتلے ساربان مہار تھا مے، سرانگی زبان میں با آواز بلند گاتے ہوئے جا رہے تھے یہ دیکھ کر کھیل نے بے اختیار ماروی سے استفسار کیا۔

”ماروی! یہ لوگ کیا گاتے جا رہے ہیں۔۔۔؟“

ماروی نے مسکرا کر بتایا۔

”یہ اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹتے ہوئے ان قافلوں کا مخصوص گیت

ہے جسے ”بیلن اور گولاڑو“ کہتے ہیں ان کا ایک گیت ہمرا چوم بھی ہوتا ہے جس کے معنی ”ساتھ آؤ“ کے ہوتے ہیں یہ بول زیادہ تر سندھی سرانگی زبان میں ہوتے ہیں اس کی بات سن کر کھیل کا اشتیاق بڑھنے لگا اور اس نے مزید آگے چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ ریت کی فضا میں اب تیش بتدریج خشکی میں تبدیل ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

قریب ہی گوٹھ کی ناریاں اور تانبے کی رنگت کی عورتیں اپنے اپنے سروں پہ بیک وقت دو۔۔۔ دو گھرے اٹھائے چلی جا رہی تھیں انہوں نے اپنی کہنیوں تک پلاسٹک کے سفید کڑے پہن رکھے تھے۔

کھیل یہ سب بڑے اشتیاق سے دیکھے جا رہا تھا اور کھیل کو اس ماحول میں دلچسپی لیتے دیکھ کر ماروی کا جی بھی خوش ہو رہا تھا مگر ایک بار پھر وہ اداسی سے بولی۔

”کھیل۔۔۔ ان بے چاروں کی زندگی بڑی کٹھن ہے تم ان کی آنکھوں میں دیکھو جنہیں ایک طلب نظر آئے گی۔ ایک بنیادی ضرورت کی طلب اور بنیادی ضرورت پانی ہے جو انہیں بہت مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔“

”حیرت ہے اتنا اچھا اور خوبصورت بلکہ ثقافتی اہمیت کا حامل یہ گاؤں جو ہمارے ملک کا حصہ ہے۔۔۔ مگر یہاں کے باسی اتنی کمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں۔۔۔“ کھیل نے ایک تکلیف دہ حیرت سے بولا۔

”ہاں۔۔۔ کھیل یہ گاؤں جتنا خوبصورت ہے۔۔۔ اس کے دکھ اندر سے اتنے ہی بد صورت ہیں۔۔۔ یہ لوگ بارش کی آس میں روز سورج کو ابھرتا اور ڈوبتا دیکھتے رہتے ہیں۔۔۔ یہاں پر کئی علاقے ایسے ہیں جہاں پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے کاشتکاری نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے بیشتر باشندوں کا ذریعہ معاش بھیڑ بکریاں پالنا ہے۔ یہاں کی عورتیں بھی اندرون سندھ کے دوسرے دیہی علاقوں کی طرح دیہات کے پیداواری عمل میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ یہ مردوں سے زیادہ سختیاں جھیلتی ہیں۔ دن بھر کے روزمرہ کام کاج کے علاوہ دور دراز کنوؤں سے پانی بھر کر لانا

روز کا معمول ہے۔ تھر میں عورتوں کا سر پر دو تین گھڑے رکھ کر چلنا عام بات ہے۔“
 ماروی اتنا بتاتا کر ذرا تھم سی گئی۔۔۔ جانے کیوں ٹھیکل کو یہاں کی سیر حاصل
 معلومات ماروی کی زبانی سن کر اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ ماروی دوبارہ گفتگو کا
 آغاز کرتے ہوئے بولی۔

”مگر یہاں اپنی سیاست چکانے والی مقتدر شخصیتیں جب ان مناظر کو
 ثقافت کا لقب دیتی ہیں تو یہ تعریف نہیں بلکہ سراسر منافقت اور بے رحمی ہوتی
 ہے۔۔۔ وہ تین گھڑوں کے بوجھ تلے ثقافت کا حسن تلاش کرنے والے یہ نہیں جانتے
 کہ ان بے چاروں کی زندگی کتنی تکلیف دہ ہے۔“

ماروی خاموش ہوئی تو ٹھیکل جیسے درد محسوس کرتے ہوئے بولا۔
 ”تو کیا حکومت کچھ نہیں کرتی ان بے چاروں کے لیے۔۔۔ میرا مطلب
 ہے کہ کوئی مربوط منصوبہ بندی جن سے ان بے چارے غریبوں کی زندگی سدھر
 سکے۔۔۔“

”حکمرانوں کو اپنی سیاسی پینترہ بازیوں سے فرصت ملے تو وہ کچھ کریں
 نا۔“ ماروی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر پانی کے حصول کے لیے یہ غریب باشندے کیا کرتے ہیں؟“ ٹھیکل
 نے دریافت کیا۔

”ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔۔۔ اس کی مثال یہاں صادق آتی
 ہے۔“ ماروی بتانے لگی۔

”یہاں کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں بڑے بڑے ٹیلے ہیں اور ان ٹیلوں
 کے دامن میں ایک جوہڑ ہوتا ہے جسے ہم ”آبڑا“ یا ”ٹوبا“ کہتے ہیں۔ یہ دشت میں
 ان کی پیاسی زندگی کی آخری امید ہوتا ہے۔ مون سون کی بارشوں میں یہ ٹوبے یا
 آبڑے پانی سے بھر جاتے ہیں اور یوں یہ غریب لوگ اپنی پانی کی ضرورت پوری

کرتے ہیں۔“

اتنا بتاتا کر ماروی خاموش ہو گئی اور پھر شام کے سائے سرمئی ہوتے دیکھ کر
 اس نے واپس حویلی چلنے کا قصد کیا اور وہ دونوں چل پڑے۔

☆.....☆.....☆

پھر رات گزر چکی تھی۔۔۔ صحرا خشک۔۔۔ فضا تلے ٹھٹھہر رہا تھا رات کی
 تاریکی میں طباق چاند عجیب پر اسرار سا منظر پیش کر رہا تھا۔۔۔ گاؤں کا ہر بڑی نفس
 خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا مگر قمر مزی پتھروں والی حویلی کے کمین ابھی جاگ
 رہے تھے۔ البتہ ان میں ٹھیکل اور لیلیٰ سو چکے تھے وہ آج خاصے تھک چکے تھے کیونکہ
 خان محمد اور ماروی نے آج انہیں اپنے گوٹھ کی جی بھر کے سیر کروائی تھی اور وہ خود بھی
 سونے کے لیے جا چکے تھے لہذا اس وقت اس کشادہ ہال نما کمرے میں وڈیرے
 جونگل خان اور اس کی بیوی مہرا لثناء اور سامنے صوفے پر احتشام اور ان کی بیوی
 براجمان تھے۔ کل صبح انہیں واپس لوٹنا تھا اور لوٹنے سے پہلے وہ کسی اہم موضوع پر
 بات چیت کرنے کے لیے ابھی تک جاگ رہے تھے۔

”جونگل سائیں بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے۔۔۔؟“

چند ٹاپے خاموشی کے بعد بالا خر سعید احتشام نے کھٹکھار کر گفتگو کی ابتدا
 کرتے ہوئے کہا۔۔۔

”بابا۔۔۔ سوچنا کیا ہے لیلیٰ میری بیٹی ہے اور بس۔۔۔“

جونگل اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کھل کر بولا۔

”تو ٹھیک ہے سائیں۔۔۔ پھر ماروی بھی ہماری بیٹی ہوئی۔۔۔“

احتشام نے بھی دوستانہ لہجے میں کہا مگر اگلے ہی لمحے وہ ششدر رہ گیا
 کیونکہ اس کی بات پر جونگل خاں یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ اس کے چہرے
 کے بدلے ہوئے تیور ظاہر کر رہے تھے کہ اسے یہ بات بہت بری لگی ہے وہ رعونت

سے بولا۔

”احتشام۔۔۔ مجھے تم سے ایسی بات کی توقع نہ تھی۔۔۔ تم جانتے ہو گے کہ ہم میں سنگ داری کی جاتی ہے دی نہیں جاتی۔۔۔ سنگ (بیٹی کا رشتہ) ہم اپنے ہی خاندان میں دیتے ہیں۔۔۔ دھاریے (غیروں) میں نہیں۔۔۔“

جونگل خان کی بات پر سعید احتشام اور بیگم احتشام دم بخود رہ گئے تھے انہیں اس دوستانہ ماحول میں اچانک پیدا ہونے والی بد مزگی کی قطعاً امید نہ تھی انہوں نے ایک لمحے کو ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چپ سادھ لی۔

☆.....☆.....☆

اینٹی ڈیکٹ فورس کے انچارج دلیر جونیر پولیس آفیسر سکندر علی کی ہلاکت کے بعد اب اس کے سر ڈی ایس پی سبھا گو خان نے اس کی جگہ لے لی تھی۔۔۔ کہاں وہ مہلگری کے مقابلے میں آنے کے لیے ہمیشہ پہلو تہی کرتا رہا مگر اب اس نے بذات خود محکمے کے حکام بالا کو سفارش بھیجی تھی کہ مہلگری کی سرکوبی کی مہم اسے سونپ دی جائے اور پھر تھوڑی پس و پیش کے بعد اوپر والوں نے اس کی درخواست قبول کر لی اب اس نے بہ حیثیت سینئر پولیس آفیسر کے اسپیشل اینٹی ڈیکٹ ٹاسک فورس کی قیادت سنبھال لی اور مہلگری اور اس کے خطرناک گروہ کا قلع قمع کرنے کے لیے نئے سرے سے حکمت عملی تیار کرنی شروع کر دی تھی۔

اگرچہ وہ یہ بات جانتا تھا کہ مہلگری تھر کے وڈیرے جونگل خان کا آدمی ہے اور بذات خود جونگل خان کتنا با اثر آدمی تھا مگر اب سبھا گو خان کو کسی بات کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اب اس کی دم پر پاؤں پڑ چکا تھا اور اس کو یقین تھا کہ مہلگری اس کے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا اس کے سامنے بار بار اس کی جوان اکلوتی اور بیوہ بیٹی کا معصوم چہرہ جو گردش کرتا رہتا تھا اس نے قسم اٹھا رکھی تھی کہ اب وہ مہلگری کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا اگر جونگل خان بچ میں آیا تو اسے بھی منہ توڑ جواب دے گا وہ خود وڈیرے

جونگل خان کے ایسے ایسے بہیمانہ رازوں سے واقف تھا جنہیں وہ طشت از بام کر دیتا تو جونگل خان جیل کی سلاخوں کی ہوا کھا رہا ہوتا اگرچہ اس کے پاس جونگل خان کے خلاف کوئی ایسے ثبوت نہ تھے لیکن ان کا حصول بھی اس کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

لہذا اس نے بلا خوف نئے سرے سے مہلگری کے خلاف منصوبہ بندی کرتے ہوئے سب سے پہلے سندھ کے ان زیریں اور کچے کے علاقوں کو پوائنٹ آؤٹ کیا جہاں اس کی خاص کمین گاہیں تھیں اور وہاں اس کی موجودگی متوقع تھی۔

ان علاقوں میں سرفہرست دادو کا نیم پہاڑی علاقہ لکھی شاہ صدر، سونا بنڈی اور دریائے سندھ کے دو اطراف میں پھیلے ہوئے گھنے جنگلات کے علاوہ کیٹی بگھیو اور کیٹی جتوئی شامل تھے۔

ایک دن وہ اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ خفیہ پولیس کے ایک مخبر نے خونی ڈاکو مہلگری کی اہم کمین گاہ کی اطلاع دی جہاں اس کی گروہ سمیت موجودگی کے شواہد ملے تھے اسے گوٹھ حبیب کوٹ اور گوٹھ رک کے میدانی اور نیم جنگلاتی علاقے میں دیکھا گیا تھا۔ سبھا گو خان سراغ ملتے ہی فوراً حرکت میں آ گیا۔

اس مرتبہ اس کی اسپیشل اینٹی ڈیکٹ ٹاسک فورس میں پولیس کے علاوہ رینجرز کے جوان اور تربیت یافتہ کمانڈرز بھی تھے کچے کے علاقوں اور طویل و ناہموار مسافتوں کو پانٹنے کے لیے تیز رفتار اور مخصوص چوڑے ٹائر والی جیپوں کے علاوہ بھاری بھر کم چوڑے ٹرک اور بکتر بند گاڑیاں بھی تھیں۔ یہ پرخطر سفر شروع کرنے سے قبل انہوں نے گوٹھ نصرت کے پولیس بیس کمپ کو اپنے خفیہ مشن کی اطلاع کر دی تھی ساتھ ہی اسے ٹاپ سیکرٹ رکھنے کا حکم دیا تھا۔

بہر کیف۔۔۔ یہ قافلہ جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر رخت سفر ہوا۔ سبھا گو خان ڈی ایس پی نے اپنے اس مشن کا نام آپریشن ڈیزرٹ فورس رکھا تھا۔

”گوٹھ نصرت“ جہاں سے انہوں نے اپنی اصل کارروائی کا آغاز کرنا تھا

لاڑکانہ سے تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا انہوں نے اپنے مہماتی سفر کا آغاز پو پھٹے ہی حیدر آباد سے براستہ سیہون شریف اور دادو سے کیا۔

قریباً پانچ چھ گھنٹوں کی نان سٹاپ اور تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد یہ سب لوگ لاڑکانہ شہر اور پھر وہاں سے گوٹھ نصرت میں بنے اپنے پولیس بیس کمپ پہنچے سورج سوانیزے پر آ پہنچا تھا گرم لو کے تھیروں نے اس کا استقبال کیا یہاں انہوں نے ذرا دیر آرام کیا اور سفر کی نکان وغیرہ اتاری۔

اب وہ اپنی مخصوص اصطلاح اور اندازے کے مطابق اپنے ٹارگٹ زون کے قریب قریب تھے۔ گوٹھ نصرت جہاں ان کا عارضی مقام تھا کچے کے علاقے کا ایک چند سو نفوس پر چھوٹا سا گاؤں تھا بہر طور آئندہ کی فیصلہ کن پیش قدمی رات کی تاریکی میں شب خون مارنے پر منبج ہوئی تھی۔

پھر جیسے جیسے شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہوئے تو سب جوان چوکس ہو کر ایک نسبتاً بڑے سے کمپ نما کوٹھری میں جمع ہو گئے جہاں ایک قدرے چوڑی اور پرانی سی میز پر سبھا گو خان لیڈنگ میپ پھیلائے اسے بغور دیکھ رہا تھا دیگر جوان بڑی مستعدی کے ساتھ خاموش کھڑے تھے البتہ گھاگ نگاہیں میز پر پھیلے نقشے پر جمی ہوئی تھیں وہ سب نقشے پر جھکے ہوئے تھے آخر سبھا گو خان اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک مارکر سے نقشے پر ایک جگہ گول سا نشان بناتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

”ہمارے مخبر کی اطلاع کے مطابق چھلگری کو اس وقت دیہہ حبیب کوٹ میں گوٹھ رک شاہ کے شمال مغرب میں یا اس کے آس پاس کچے میں پایا جانا چاہیے۔“

چند ثانیے کے بعد وہ دوبارہ بتانے لگا۔

”مذکورہ علاقہ ذرا میدانی اور مٹی کے اونچے ٹیلوں پر مشتمل ہے جدھر پھوگ، آک اور روہیر کی بعض دوسری قد آدم جھاڑیاں اور کیکر کے درخت وغیرہ ایک جنگل بناتے ہیں اس علاقے کی ایک جانب جہاں کیکر وغیرہ کا کافی گنجان جنگل سا پھیلا ہوا

ہے اور ایک ریلوے لائن بھی قوس کی صورت میں آگے جا کر مڑ رہی ہوتی ہے ادھر چوڑے پائوں والے دو دریا بیک وقت شاخوں کی صورت میں منقسم ہو کر بہتے ہیں جن میں ایک رائس کینال اور دوسرا دادو کینال کے ناموں سے موسوم ہیں یہی جگہ یا اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ ہمارا ٹارگٹ زون ہے۔“

اتنا بتا کر سبھا گو خان چند لمحے خاموش ہوا۔ فورس کے دیگر جوان بغور اس کی بات سن اور سمجھ رہے تھے پھر سبھا گو خان نے مارکر کو اپنی انگلیوں میں پھنساتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”یہاں سے ہم دو حصوں میں تقسیم ہو کر ٹارگٹ کی جانب پیش قدمی کریں گے ایک حصہ یعنی ایک پارٹی ٹارگٹ کو آگے سے کور کرے گی اسے ہم اپنی سہولت کے لیے اپر پارٹی کہیں گے جو حملے میں پہل کرے گی اور اس کی کمان میرے ہاتھ میں ہو گی جبکہ دوسری پارٹی ٹارگٹ کو عقبی سمت سے کور کے صرف گھات لگائے بیٹھی رہے گی یعنی یہ حکم کی منتظر رہے گی اسے ہم لینڈس ڈاؤن پارٹی کہیں گے اس کا کام وائرلیس سیٹ پر ملنے والے حکم پر دشمن کو بوکھلانے اور ان کا مورال توڑنا ہو گا یہ دشمن کے خلاف ایک نفسیاتی حملہ بھی کہلائے گا اور اس کی قیادت انسپٹر محمد بجل جانوری کے ہاتھ میں ہو گی۔“

یہ کہتے ہوئے سبھا گو خان نے اپنے سامنے کھڑے ایک مضبوط تن و توش کے حامل شخص کی طرف دیکھا یہ انسپٹر محمد بجل جانوری تھا اس نے اپنے انفر کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے فوراً اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر مکمل تعمیل کا یقین دلایا۔

”ایہی۔۔۔ کوئی چیز۔۔۔“

سبھا گو خان نے آخر میں اپنی بلند آواز میں جوانوں سے پوچھا۔

”نوسر۔۔۔“ سب بیک وقت اور مستعدی سے بولے۔

”اوکے۔۔۔ اب فوراً گاڑیوں کو ”ٹاپ آف“ کرو ہمیں ابھی نکلنا

ہے۔۔۔ ہری اپ۔۔۔“

☆.....☆.....☆

سعید احتشام اپنے اور وڈیرا جونگل خان کے درمیان ہونے والے گفتگو کے بارے میں ٹھیک اور لیلیٰ کو آگاہ کر چکا تھا نیز یہ بھی بتا دیا تھا کہ جونگل خان نے لیلیٰ کا رشتہ تو اپنے بیٹے خان محمد کے لیے قبول کر لیا تھا مگر اپنی بیٹی ماروی کا رشتہ ٹھیکل کو دینے سے بڑی رعونت کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔

ٹھیکل کو خاص طور پر اس بات کا دکھ پہنچا تھا اور وہ ماروی کے باپ کے انظار سے مایوس ہو چکا تھا وہ ان وڈیروں کی ضد اور اتنا سے خوب واقف تھا تب اسے ماروی کا وہ جملہ یاد آنے لگا اس نے جواباً اس سے کہا تھا۔

”ہم لڑکیاں جتنی بھی پڑھ لکھ جائیں مگر ہمیں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔“

آج اسے ماروی کی یہ بات درست معلوم ہو رہی تھی، ٹھیکل کو اب ایک اداس سی چپ لگ گئی تھی۔

یہ سب لوگ اگلے ہی دن علی الصباح اپنی لینڈ کروزر میں سوار ہو کر حیدر آباد لوٹ آئے تھے اور اس وقت اپنی عالیشان کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔

ٹھیکل نے مزید اس سلسلے میں اپنے والدین سے کوئی بات کرنے سے گریز کیا تھا تاہم بیگم احتشام روایتی ماؤں کی طرح اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

ہمارے بیٹے کو رشتوں کی کیا کمی ہے، دنیا میں کوئی ایک ماروی ہی تو نہیں ہزاروں ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک۔۔۔“

”آپ درست کہتی ہو ممال۔۔۔“ ٹھیکل رسان سے بولا۔
”واقعی دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں ایک ماروی ہی تو نہیں ہے۔“ ٹھیکل کی

ذو معنی بات بیگم احتشام کے دل کو لگی تھی۔

”آپ لوگ مجھے رہنے دیں آپ اگر چاہیں تو لیلیٰ بہن کے لیے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”واہ۔۔۔ یہ بھی خوب رہی۔۔۔ اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ تو قبول کر لیا مگر بھائی ٹھیکل کے لیے انہوں نے تنگ نظری کا ثبوت دیا، پھر مجھے بھی یہ رشتہ منظور نہیں۔“ لیلیٰ اپنے بھائی ٹھیکل کا اشارہ سمجھتے ہوئے تنگ کر بولی۔

”نہیں لیلیٰ۔۔۔ میرے معاملے میں تم خود کو ملوث نہ کرو، تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔“ ٹھیکل نے اپنی بہن سے کہا تو اس کی بات پر لیلیٰ حیرت اور قدرے خفگی سے بولی۔

”بھائی۔۔۔ یہ آپ اتنی غیریت کیوں دکھا رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ کا دکھ میرا دکھ نہیں۔۔۔ میں بہن ہوں آپ کی۔۔۔“

چند ثانیے کے بعد وہ بالآخر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔
”اگر انہیں بھائی کا رشتہ قبول نہیں تو میری طرف سے بھی انکار سمجھا جائے۔۔۔ میں سمجھتی ہوں مجھے مجبور نہیں کیا جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

سعید احتشام اور بیگم احتشام خاموش بیٹھے تھے، انہوں نے فی الحال دونوں کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا تاہم انہیں بھی حسب توقع جواب لیلیٰ سے مل چکا تھا دراصل وہ خود بھی یہی چاہتے تھے اور لیلیٰ نے ان کی یہ مشکل آسان کر دی تھی، انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا بیٹا ٹھیکل ماروی کو پسند کرتا ہے اور یہی صورت حال جونگل خان کے بیٹے خان محمد کی لیلیٰ کے سلسلے میں تھی لیکن جونگل خان نے خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے کے لیے تو لیلیٰ کا رشتہ منظور کر لیا تھا مگر اپنی بیٹی ماروی کا رشتہ ٹھیکل کو دینے سے صاف انکار کر دیا تھا اور یہی بات ان دونوں میاں بیوی

کے علاوہ لیلیٰ کو بھی بری لگی تھی۔

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس وقت وڈیرے جونگل خان کا فون آ گیا۔ چند رسی باتوں کے بعد جونگل خان اپنے مخصوص کھر کھراتے لہجے میں بولا۔

”ہاں بابا۔۔۔ پھر ہم کب آئیں لیلیٰ بیٹی کو انگوٹھی پہنانے۔۔۔“ احتشام کو اتنی جلدی جونگل خان کے فون کے آنے کی توقع نہ تھی تاہم وہ سنجیدگی سے بولا۔

”جونگل سائیں آپ ضرور آئیں، آپ کا اپنا گھر ہے۔ رہی انگوٹھی والی بات تو اس کے بارے میں فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔“

چند ثانیے کی خاموشی کے بعد سعید احتشام دوبارہ بولا۔

”دراصل آپ کی طرح ہماری بھی کچھ روایات ہیں۔“ سعید احتشام کے لہجے میں ایک کاسی آ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے بابا۔۔۔ آپ کی روایات کا ہم دل سے احترام کریں گے۔“ دوسری جانب سے جونگل خان کی آواز ابھری۔

”مجھے آپ سے یہی امید تھی جونگل سائیں۔۔۔“ سعید احتشام کا لہجہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ تاہم پھر بھی وہ اپنے لہجے کے طنز کو لفظوں میں عیاں کئے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔

”دراصل جونگل سائیں۔۔۔ ہم اپنے بچوں کے معاملے میں کھلے دل رکھتے ہیں، ان پر مرضی تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اس سلسلے میں لیلیٰ بیٹی کی رائے کو پہلے فوقیت دوں گا۔“

”بچیوں سے کیسی رائے لینا بابا۔۔۔“ دوسری طرف سے جونگل خان کی بھاری آواز گونجی۔

”عورتوں کو اگر اتنا ہی عقل کل سمجھا جاتا تو آج طلاق کا اختیار مرد کے پاس نہ ہوتا بابا۔۔۔“

جونگل خان کی اس بات پر سعید احتشام کو ان کی ذہنی پسماندگی کا احساس ہوا اسے یہ بات بری لگی تھی تاہم وہ ہموار لہجے میں بولا۔

”نہیں جونگل سائیں تعلیم نے عورت کو اب برے بھلے کی تمیز سکھا دی ہے ہمیں اپنی تربیت پر مکمل بھروسہ ہے کہ ہماری تربیت ہمارے نظریات سے کبھی متصادم نہیں ہو سکتی۔“

”اچھا بابا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔“ وڈیرا جونگل خان شاید احتشام بابر کی گفتگو سے بو جھل اور بیزار سا ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ ضرور لیلیٰ بیٹی سے اس کی مرضی پوچھ لو ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر یہ بھی ذہن میں رہا چاہیے کہ وہ ہمارے بیٹے خان محمد کی پسند ہے، اللہ حافظ۔۔۔“ دوسری طرف سے فون آف ہو چکا تھا۔

”بے وقوف! خود کو سمجھتے کیا ہیں، اپنی اوطاقوں میں دو چار غریب ہاریوں پر تسلط جما کر ساری دنیا کو اپنی میراث سمجھنے لگتے ہیں۔“ سعید احتشام اپنے دانت بھیج کر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

ان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اہل خانہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں دوستوں میں بدمزگی کی ابتداء ہو چکی ہے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ سعید احتشام نے جونگل خان کے خلاف ایسے کلمات ادا کئے تھے، وہ ہنوز غصے میں بل کھا رہے تھے۔

”کم آن۔۔۔ شامی۔۔۔ ٹیک اٹ ایزی۔۔۔ پلیز ڈونٹ ٹیک دی سیریلی دس میٹر۔۔۔“ ان کی بیگم ازراہ تشریفی ان سے بولی اور ان کے لیے چائے بنانے لگی۔

☆.....☆.....☆

ادھر خان محمد اور ماروی پر بھی موجودہ حالات کی تبدیلی واضح ہو چکی تھی جس کا واضح ثبوت نکیل اور لیلیٰ کی وہ سرد مہری تھی جو انہوں نے روا رکھی تھی کیونکہ کافی روز گزر

جانے کے باوجود بھی شہر سے ان دونوں بہن بھائیوں کا کوئی فون نہیں آ رہا تھا ورنہ تو ان کے گونہ آتے ہی اکثر فون پر گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔

ادھر جب ماروی کے بھائی خان محمد نے لیلیٰ سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو اسے دوسری طرف سے کوئی دوستانہ رسپانس نہیں ملا سوائے روکھے پھکے ”ہائے ہیلو“ کے۔۔۔ علاوہ ازیں لیلیٰ نے خان محمد سے کسی خاص ٹاپک پر بھی گفتگو کرنے سے بھی احتراز کیا تھا جس پر خان محمد کی روایتی اکھڑ مزاجی اور خود ساختہ انا نے یکدم ضد کا روپ دھار لیا تھا، ایسی ضد جس کے پیچھے ذاتی عناد کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ ادراک تو اسے حقیقت کا ہو ہی چکا تھا کیونکہ اس کے باپ نے جب اس کی بہن ماروی کا رشتہ ٹھیکل کو دینے سے انکار کر دیا تھا تو بھلا پھر سعید احتشام کس طرح اپنی بیٹی کا رشتہ خان محمد کو دے سکتا تھا، اس سلسلے میں ماروی کی سوچ بالکل غیر جانبدارانہ تھی۔

اگرچہ وہ خاموش تھی مگر دل سے یہ بات تسلیم کر چکی تھی کہ اگر اسکے بادا جانی نے اس کا رشتہ دینے سے انکار کیا ہے تو وہ بھی یہی حق رکھتے ہیں تاہم ماروی کو اس بات کا افسوس تھا کہ اتنے عرصے کی دوستی اب سرد جنگ میں بدل جائے گی بلکہ بدل چکی تھی، غرض دونوں خاندانوں کے دلوں میں خلیج بڑھنا شروع ہو گئی تھی اور اس دن تو مہر ثبت ہو گئی جب دؤیرا جونگل خان نے کچھ عرصے بعد دوبارہ سعید احتشام کا لیلیٰ کے رشتے کے سلسلے میں دوبارہ فون کیا تو انکار کی صورت میں سعید احتشام باہر کی طرف سے صاف جواب مل گیا۔

☆.....☆.....☆

”بابا سائیں۔۔۔ لیلیٰ صرف میری ہے اور بس۔۔۔ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ دیکھتا ہوں آپ کا سعید احتشام کیا کرتا ہے۔“ اس دن خان محمد اچانک حیدر آباد ”بجھر ہاؤس“ جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ باپ سے مڈ بھیڑ ہونے پر اس نے اپنے عزائم کا برملا اظہار کر ڈالا تھا۔

”نا۔۔۔ میڈا پٹ۔۔۔ نا۔۔۔ ذرا ماٹھ (صبر) کر۔۔۔ تو اپنے بابا سائیں کے ہوتے ہوئے کیوں گڑتی (فکر) کرتا ہے بابا۔۔۔“ جونگل خان اپنے بیٹے کے عزائم کا اندازہ لگاتے ہوئے اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”بابا سائیں۔۔۔ احتشام باہر تو آپ کے خاص الخاص دوستوں میں سے ایک تھا، اس کے باوجود اس نے لیلیٰ کا رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا ہے، اب کس بات کا صبر کروں میں۔۔۔“ خان محمد جھلا کر بولا۔

”ہالا بابا ہالا۔۔۔۔۔ جوانی کا جنوں ہے تیرا ڈھو (قصور) نہیں۔۔۔“ دؤیرا جونگل خان بیٹے کو تسلی دینے کی غرض سے بولا۔

”دیکھو بابا۔۔۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔۔۔ سیاست بھی کی ہے اور دھونس اور دھمکی سے بھی کام نکالا ہے مگر بہت۔۔۔ ٹیڑھے اور ناممکن کام ہم نے دھمکی سے نہیں بلکہ سیاست سے نکالے ہیں، آج جس سیٹ پر تمہارا احتشام موجود ہے نا۔۔۔ یہ بھی ہماری ہی وجہ سے ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بچوں کے معاملے میں اچھے اچھے لنگویے یا رہی دانت نکوس کر سامنے آ جاتے ہیں۔“ اتنا کہہ کر جونگل خان ذرا اٹھا پھر جاتے جاتے خان محمد کے کاندھے پر تھپکی مارتے ہوئے بولا۔

”اگر مخالف سے لڑنا ہے تو غصہ مت کرو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور مخالف تم پر غالب آ جائے گا۔ یاد رکھنا میری بات۔۔۔“

☆.....☆.....☆

رات انتہائی تاریک تھی، ہر طرف ہولناک ویران سناٹا پھیلا ہوا تھا، ذرا دور گھٹنا جنگل کسی آسیب کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا، ہوا پاکیزہ روح کی مانند مخورام تھی، قریب ہی رائس کینال کا پانی سبک روی سے بہہ رہا تھا جس کی جھللاتی سطح پر آوارہ بدلیوں سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا نیم پوشیدہ چاند کا عکس لرزاں بر اندام تھا، ایک ریلوے لائن بھی دور تک جا کر بائیں سمت میں بل کھاتی ہوئی تاریکیوں میں گم ہو رہی تھی۔

ڈی ایس پی سبھاگو خان اپنی ”اپر پارٹی“ کے ہمراہ ”ٹارگٹ“ کی جانب پیش قدمی کر چکا تھا جبکہ دوسری ”لینڈ ڈاؤن پارٹی“ اسپیکٹر محمد بچل جانوری کی سرکردگی میں آگے بڑھ رہی تھی۔

چند لمحوں بعد سبھاگو خان کو دائر لیس پر اطلاع موصول ہوئی، یہ اسپیکٹر محمد بچل تھا، وہ پر جوش آواز میں بولا۔

”سر! خبر کی اطلاع بالکل درست ہے، ہم نے متوقع ٹارگٹ کو عقبی سمت سے کور کر رکھا ہے، اپنی آرڈر سر۔۔۔ اور۔۔۔“

”شاباش بچل۔۔۔ تم انہیں کور کئے رکھو، ہوشیاری کے ساتھ اگلے حکم کے منتظر رہنا، جب تک گرین سنگل تمہیں نہ دیا جائے، حملہ نہ کرنا۔۔۔ اگر خطرہ محسوس کرو تو بلا درلغ تم اپنی مرضی کے مطابق بدلتی چومیشنز سنبھال سکتے ہو۔۔۔ اور۔۔۔“ سبھاگو خان بولا۔

”اوکے! رائٹ سر۔۔۔ اور۔۔۔“ بچل نے کہا۔

”ٹھیک ہے اور۔۔۔ اینڈ آل۔۔۔“ سبھاگو خان نے دائر لیس آف کیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے چل پڑا۔ یہ سب بچپوں اور بکتر بند گاڑیوں میں ”رائس کینال“ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

گاڑیوں کی تمام ہیڈ لائٹس آف تھیں، تھوڑی دیر بعد چاند کی نیم تاریکی میں محسوس رہنے کے بعد وہ ایک پلایا کے ذریعے رائس کینال کو پار کر کے اب کیکر کے تاریک جنگل میں داخل ہو گئے تھے، ان سب کے دل کنپٹیوں میں دھڑک رہے تھے وہ کسی بھی لمحے بدنام زمانہ خطرناک اور خونی ڈاکو جھلگری سے نبرد آزما ہونے کے لیے بالکل تیار تھے، ایک مقام پر انہیں اچانک مشرق کی سمت گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی اور پھر تو جیسے سارا جنگل دھماکوں سے گونج اٹھا۔ یہ لوگ بری طرح ٹھٹھک گئے تھے۔

سبھاگو خان کا پہلا خیال ”لینڈ ڈاؤن“ پارٹی کی طرف گیا تھا، شاید ان کی پہلے جھلگری کے گروہ سے ڈبھٹھڑ ہو گئی تھی، وہ ضرور دیکھ لئے گئے تھے کیونکہ فائرنگ کے آہنگ سے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایک طرفہ فائرنگ نہیں بلکہ ”تبادلہ فائرنگ“ تھی اور اس خیال کے چند ثانیے بعد تصدیق بھی ہو گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے دائر لیس پر سبھاگو خان کو اطلاع ملی دوسری جانب محمد بچل کی ہانپتی ہوئی آواز آرہی تھی۔

”سر۔۔۔ بد قسمتی سے ہم ٹر لیس کر لئے گئے ہیں اور اپنے دفاع کے لیے مجبوراً میں نے فائرنگ کے آرڈر جاری کر دیئے ہیں، اب میرے لیے کیا حکم ہے سر۔۔۔ اور۔۔۔“

”ٹھیک ہے تم محاصرہ اور فائرنگ جاری رکھو، میں گاہے بگاہے تم سے رابطہ بھی کرتا رہوں گا۔۔۔ اور۔۔۔ اینڈ آل۔۔۔“

سبھاگو خان نے کہا اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنے نوجوانوں کو مخصوص اشارہ کیا اور ان سب نے ایک ایک اپنی جدید ساخت کی گنیں سیدھی کر لیں، ان کے پاس راکٹ لانچرز بھی تھے، انہوں نے فوراً گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں اور آگے بڑھنے لگے۔ ایک خونریز معرکہ ان کا منتظر تھا، اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ ”لینڈ ڈاؤن پارٹی“ کو ٹر لیس کر لیا گیا تھا کیونکہ اب خود بخود ان پارٹیوں کی حیثیت بدل گئی تھی یعنی جو کام ان کی ”اپر پارٹی“ نے کرنا تھا وہ مجبوری کے تحت پہلے ”لینڈ ڈاؤن پارٹی“ نے کر ڈالا تھا۔

اب اس مذکورہ پارٹی کا کام سبھاگو خان کی ”اپر پارٹی“ سرانجام دینے والی تھی جو دشمن کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

پرتیش بیڈ روم میں اس وقت اسٹیریو ڈیک پر گیت کے بول ماروی کو مدھوش کئے دے رہے تھے، وہ جہازی سائز کے نرم و گداز بیڈ پر نیم دراز موسیقی سے

لطف اندوز ہو رہی تھی، بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا کلاک دن کا ایک بج رہا تھا۔

پھر کمرے میں گونجتی ہوئی گیت کی آواز معدوم ہو گئی شاید کیسٹ ختم ہو چکی تھی البتہ خالی کیسٹ کے چلنے کی گھر۔۔۔ گھر کی آواز ڈیک سے ابھر رہی تھی۔

ماروی نے اپنی سرنگیں سرنگیں آنکھیں یکدم یوں جھپک کر کھولیں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ہو، تب وہ ایک گہری سانس کھینچ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ یکا یک اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر کوئی ساز بج رہا ہو، ایسا ساز جس کی لے اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جانا چاہتی ہو، ساز کا طلسم اسے جکڑے لے جا رہا تھا۔

اس کے دل کے نہاں خانوں میں کسی کی دھندلی دھندلی شبیہ سی ابھر رہی تھی پھر جیسے وہ واضح ہوتی چلی گئی اور اب اس نوجوان بیراگی کا سانولا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

وہ حیران تھی کہ ایک عام سے معمولی لڑکے نے اس جیسی لڑکی کے اندر ایسی کیا جوت جگا دی ہے کہ اسے اچھا بھلا بیٹھے بیٹھے بے قراری سی ہو جاتی ہے اور بے قراری بھی ایسی کہ اسے گھٹن کا احساس ہونے لگتا تھا جب وہ اپنی عالیشان حویلی سے نکل کر اس دیوانے سانول کی جھونپڑی میں جا پہنچتی تو اسے قدرے قرار ملتا۔

اور اس وقت بھی ایسا ہوا بیٹھے بیٹھے اچانک اسے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا اور دل بے اختیار باہر کی جانب مائل بہ حرکت ہونے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ وسیع و عریض صحرا میں کھڑی تھی، یہ دشت اسے بڑا سکون اور روان بخشتا تھا۔ باہر اس وقت سماں ہی اور تھا، مون سون کی بارشوں کی خوشیوں میں لوگوں نے دھمال ڈال رکھا تھا ایک طرف آبزوں اور جوڑوں میں ننگ و دھڑنگ بچے نہا رہے تھے دوسری جانب گوار، باجرہ کے ہرے بھرے کھیتوں کی منڈیروں پر لڑکیاں رنگین چولیوں اور شوخ گھاگھارے پننے، چھاج میں اناج پھینکتے ہوئے ”مورٹور“ گنگنا رہی تھیں۔ تو کہیں خاکستری پیٹھوں والے ساربان اونٹوں کی مہاریں تھامے ”سرامڑی“ لاپتے ہوئے

چلے جا رہے تھے۔

ماروی ان دلفریب مناظر میں ڈوبی ہوئی بے خودی میں پایادہ چلتی اس ”جبل بھٹ“ تک آ پہنچی جہاں کیکر تلے نوجوان مجذوب سانول کی جھونپڑی تھی۔

جھونپڑی کے ذرا قریب پہنچ کر ماروی کو ٹھٹک کر رکنا پڑا، اس نے دیکھا کہ سانول کی جھونپڑی کے قریب کچھ لوگوں کا ہجوم تھا، جن کے چہرے عقیدت و احترام میں ڈوبے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں انواع و اقسام کی اشیاء بطور ”نذرانہ“ تھامے ہوئی تھیں، ماروی اکثر یہ مجمع سانول کی جھونپڑی کے پاس دیکھا کرتی تھی اور اسے دیکھ کر سخت ذہنی کوفت ہوتی تھی، وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سانول کی جھونپڑی کے قریب پہنچی تو اسے اندر سے سانول کے کسی پربرہم ہونے کی آوازیں آتی سنائی دیں، ماروی نے بغور سنا، وہ غصے میں تھا اور اسے ”نذرانہ“ دینے آئے ہوئے لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا کہہ رہا تھا۔

ماروی حیرت سے سوچنے لگی کہ یہ لوگ بھی کتنے سادہ لوح ہیں۔ ایک ایسے شخص سے اپنی حاجتیں اور منتیں مانگنے کے لیے آرہے ہیں جو خود بے چارہ حاجت مند ہے، سب کچھ تیاگ کر اس دور دراز اور بے آب ریگستان میں جھونپڑی ڈال کر پڑا رہنے والا بھلا کس طرح ان کا نجات دہندہ یا حاجت روا بن سکتا ہے، جب اس نے اپنے اس خیال کا اظہار وہاں موجود لوگوں سے کیا تو اسے بڑا ہی جاہلانہ جواب سننے کو ملا تھا۔

لوگوں کے خیال کے مطابق گھربار چھوڑ چھاڑ کر اور نکالیف و صعوبتیں کاٹنے والا بیراگی اللہ کے قریب ہوتا ہے۔

”تم لوگ آخر کیوں اس غریب کو بار بار تنگ کرنے یہاں آتے ہو؟“
بالآخر ماروی سے رہا نہ گیا اور اس نے قریب کھڑی عورتوں کی ٹولی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اے۔۔۔ کیا اکتی (کہتی) ہے معافی گھن (ماگ) آئی (لڑکی)۔۔۔
بھلا این (ہم) بھٹ سائیں کو کیوں تنگ کرے ساں۔۔۔“ ایک بچی عمر کی خزانہ
سی عورت نے تنگ کر جواب دیا۔

”تو کیا غلط کہہ رہی ہوں۔۔۔“ ماروی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا
قریب کھڑے دیگر لوگ بھی حیرت و دلچسپی کے ساتھ ان کی ٹکرا سن رہے تھے۔
”تم لوگ آخر کیوں اسے تنگ کر رہے ہو، وہ تو تمہاری بات سننے کو بھی تیار
نہیں ہے۔“

”بی بی یہ بے پردہ بندے اللہ کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ قریب کھڑے
ایک کچھی سے بوڑھے نے اپنے جواب سے نوازا، اور ماروی کو اس کی سوچ پر افسوس
ہونے لگا۔

اثنائے راہ انہی عورتوں میں سے ایک سانولی سی عورت جس نے میلا سا
گھاگھرا اور پیلی چولی پہن رکھی تھی اپنے گولہوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ماروی سے بولی۔
”تم یہ بتاؤ پہلے کہ تو خود یہاں کیا کرنے آئی ہے۔۔۔“ اس کی بات پر
ماروی چونک سی گئی، وہ لا جواب ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

خان محمد نے اپنے باپ جو نگل خان کی بات بظاہر غور سے سنی تھی مگر خان محمد
اکھڑ مزاج اور ضدی نوجوانوں میں سے تھا جو بظاہر دوسروں کی تلقین کو تو توجہ سے سنتے
ہیں اور عارضی طور پر رضا مند بھی دکھائی دیتے ہیں مگر کرتے بالا خرد ہی ہیں جو ان کے
اندرونی ہوتی ہے۔

خان محمد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا، اس نے سب باتوں کو بالائے طاق
رکھ کر خود ہی اس مسئلے سے بچنے کی ٹھانی اور سب سے پہلے اس نے حیدر آباد کا قصد کیا
اس کے یوں اچانک حیدر آباد جانے پر گھر والوں کو اچنبھا ہوا مگر اس نے حیدر آباد

اپنے کسی دوست کی شادی میں آنے کا عذر بتا کر بحیرہ لئے سیدھا ”کنچھر
ہاؤس“ آ گیا۔

یہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اپنے رازدار دوست دادن سندھو سے
رابطہ کیا، وہ یونیورسٹی کیسپس میں رہائش پذیر تھا، وہ گھٹے ہوئے جسم کا مالک، ایک
رعونت آمیز نوجوان تھا، اسے بھی اپنے جگری یار خان محمد کے یوں اچانک گوشہ سے
واپسی پر حیرت ہوئی تھی۔

اس وقت وہ دونوں کنچھر ہاؤس کے ایک پر قیث کرے میں دبیز قالینوں پر
گاؤں تکیے رکھے آٹے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، ان کے درمیان طشتری پر اشیائے
خورد و نوش رکھی ہوئی تھیں، دیوار گیر کلاک اس وقت رات کے گیارہ بج رہا تھا
اور کمرے کی فضاء ایئر کنڈیشن کی وجہ سے خاصی خنک ہو رہی تھی۔

”خیر تو ہے خانو۔۔۔ یوں اچانک۔۔۔“

”دادن تجھے سے چیوڑا منہ میں دال کر دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بولا
اور بلوریں پیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”دادن۔۔۔ لیلیٰ کو جانتے ہونا۔۔۔؟“ خان محمد عجیب سے لہجے میں بولا۔
”ہاؤ سائیں۔۔۔ وہی نا۔۔۔ جو ہماری بھاجائی (بھابھی) بننے والی
ہے۔“ دادن معنی خیز لہجے میں بولا۔

”ہاں دادن وہی۔۔۔ اسے اغوا کرنا ہے۔“

خان محمد سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کا خیال تھا کہ دادن اس کی
بات پر چونک پڑے گا مگر اس کی بات سن کر دادن کے ہونٹوں کے باریک کنارے ذرا
پھیل سے گئے پھر وہ اگلے ہی لمحے انتہائی سنجیدہ نظر آنے لگا اور بولا۔

”دیکھو یار۔۔۔ ہم یاروں کے یار ہیں، تیری دوستی پر سر لگاتے ہیں، میری
بات کا غلط مطلب نہ لینا۔“

وہ چند لمحے توقف کے بعد دوبارہ بولا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم نے سارے پہلوؤں پر غور تو کر لیا ہے نا۔۔۔“

خان محمد اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ذرا ہنسی سے بولا۔

”تو اس کے باپ سے ڈرتا ہے۔۔۔ کیا ہم گھٹ ہیں کسی سے۔۔۔“

”میری بات کا تو نے آخر غلط مطلب لیا ہے نا۔۔۔“ دادن نے شکایتی لہجے

میں کہا۔

”میرا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر لیلیٰ کو اغوا کرنے سے تمہارا مقصد پورا ہو

سکتا ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں یا۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ اسے اغوا کر کے صورتحال بگڑ

جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔“

”ٹھیک ہے یا۔۔۔ تو میرا ساتھ نہیں دیتا ہے تو نہ دے۔۔۔ میں گوٹھ سے

اپنے ”ہمراہ“ (ساتھی، آدمی) لے آؤں گا۔“ خان محمد روایتی اکھڑ مزاجی سے بولا۔

”یہی میں چاہتا تھا خانو۔۔۔“ دادن اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے طمانیت

سے بولا اور خان محمد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ میں نے تم سے اس لیے کہا تھا کہ۔۔۔ اگر بعد میں تمہارے قدم

ڈمگنے لگیں تو میں تمہیں بے وفائی کا طعنہ یاد دلا سکوں۔۔۔ چل اٹھ میں تیرے

ساتھ ہوں۔“ اس کے بعد وہ آئندہ کالائٹ عمل طے کرنے لگے۔

درحقیقت دادن کو حالات کا ادراک تھا، وہ لیلیٰ کی حیثیت سے اچھی طرح

واقف تھا، وہ یونیورسٹی کی کوئی عام لڑکی نہ تھی کہ ترنوالہ بن جاتی اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی

، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لیلیٰ سیکرٹری سطح کے معروف بیورو کریٹ کی بیٹی ہے اسے

اغوا کرنے کا مطلب پورے صوبے کی مشینری کو اپنے پیچھے لگانا تھا۔

☆.....☆.....☆

لیلیٰ پر آج کل قنوطیت نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا ہوا تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ ماروی تھی جس سے آج کل اس کی بات چیت تقریباً بند تھی یوں تو لیلیٰ کی اور بھی کئی سہلیاں تھیں مگر ماروی اس کی واحد سہیلی تھی جس سے وہ کافی حد تک ”کلوز“ ہو جایا کرتی تھی اور اسے اس کی سنگت میں بڑی آسودگی محسوس ہوتی تھی مگر جب سے دونوں خاندانوں کے مابین رشتوں کا تنازع ہوا تھا، تب سے ان کی دوستی کے بیچ بھی غیر محسوس طور پر خلیج حائل ہوتی چلی گئی۔

وہ اوائل جون کی ایک گرم شام تھی لیلیٰ کا دل اس دن اتنا اکتایا تھا کہ اس

نے اپنی کارنکالی اور بلا سوچے سمجھے ڈرائیونگ پر نکل گئی، وہ اس بات سے یکسر بے خبر

تھی کہ ایک اور گاڑی بھی اس کے تعاقب میں لگ چکی ہے۔

وہ اطمینان سے کار میں لگے ڈیک پرائیم سی ہیمر کوسن رہی تھی، اس کی گاڑی

کافی دیر تک مختلف بھری پری شاہراہوں پر دوڑتی رہی پھر ایک ایسی ذیلی سڑک کی

طرف مڑ گئی جو نسبتاً ویران تھی، اکادکا گاڑیوں کے علاوہ وہاں کسی کا گزرنہ تھا، اس کے

تعاقب میں آتی ہوئی گاڑی اچانک اسے اس کرتی ہوئی عین سڑک پر ترچھی ہو کر

کھڑی ہو گئی۔

اگر لیلیٰ نے بروقت بریک پر پاؤں نہ رکھ دیئے ہوتے تو اس کی کار سامنے

راہ رو کے کھڑی جیپ سے ٹکرا جاتی، کار کے ٹائر زور سے چرچرائے اور کار ایک جھٹکے

سے رک گئی۔

لیلیٰ کی کار کے رکتے ہی سامنے راستہ رو کے کھڑی جیپ سے چند افراد

جنہوں نے اپنے چہروں پر اجرکوں کے ڈھانٹے باندھے ہوئے تھے، راٹھلیں تھامے

باہر کو کودے اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لیلیٰ کی کار کے قریب آ کر ڈرائیونگ سیٹ

کا دروازہ کھولا اور ہکا بکا بیٹھی لیلیٰ کو بیدردی سے کھینچ کر باہر نکال لیا اور پھر اس سے

پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ایک ”ڈھانٹا پوش“ نے اس کی ناک پر دو مال رکھ دیا اور دوسرے ہی

لمحے وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو کر ڈھانٹا پوش کے بازوؤں میں جھول گئی تب انہوں

نے لیلیٰ کے بے سدھ جسم کو اٹھا کر آٹا فانا اپنی جیب میں ڈالا اور وہاں سے ہوا ہو گئے۔
لیلیٰ کی کار کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور اندر سے ایم سی ہیر ”کیئن ٹچ دس“ کا رہا
تھا۔

☆.....☆.....☆

وڈیرا جونگل خان کو اپنے بیٹے خان محمد کا یوں اچانک شہر چلے جانا ایک بے
نام سی تشویش میں مبتلا کر رہا تھا، وہ آخر اس کا باپ تھا، اپنے بیٹے کی آتش مزاجی سے
واقف تھا، اسے ڈرتا تھا کہیں خان محمد غصے اور طیش میں آ کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھالے جو
بعد میں اس کے لیے مصیبت بن جائے۔

وہ جب تک حویلی میں موجود تھا، جونگل خان کو اس طرف سے تسلی تھی مگر پھر
یوں اچانک شہر بھر ہاوس چلے جانا، اسے اچھنبے اور کسی قدر تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔
جونگل خان نے چند لمحوں بعد اپنے مصاحب خاص جبل کو اپنے کمرہ خاص
میں بلایا۔

”حاضر سائیں وڈا۔۔۔“ وہ اندر آتے ہوئے مودبانہ بولا۔

”بابا۔۔۔ پٹ خان محمد کی طرف سے ذرا پریشانی ہو رہی ہے۔“ جونگل
خان عالم پریشانی میں دھیرے سے بڑبڑایا۔

”بھوتار سائیں۔۔۔ چھوٹے سائیں پر میرا کنب قربان، ہماری حیاتی بھی
اسے لگے، خیریت تو ہے نا۔۔۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں قدرے چونک کر بولا۔

”اڑے بابا۔۔۔ خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ وڈیرا جونگل خان اپنی کھنی
بھنوں کو سکڑتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

”پٹ خان محمد اچانک شہر چلا گیا ہے، وہ ضرور کچھ ہاوس میں ہو گا۔ تم ایک
کام کرو اس کی دن رات نگرانی کے لیے کسی ایک خاص بندے کو بھیجو جو نہ صرف ہو
ہوشیاری کے ساتھ نظر رکھے بلکہ اس کی پل پل کی سرگرمیوں کی اطلاع بھی دے

سکے۔“

وڈیرے جونگل خان کی بات سن کر مٹی جبل عجیب مخمضے کا شکار نظر آنے لگا
اسے یہ کام قدرے عجیب اور پیچیدہ سا لگا رہا تھا جس کا وہ وڈیرا جونگل خان سے برملا
اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا، وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے مودبانہ اور ذرا جھجک کر بولا۔

”سس۔۔۔ سائیں۔۔۔ وڈا۔۔۔ چھ۔۔۔ چھوٹے سائیں کی نگرانی
۔۔۔ بھلا یہ کس طرح۔۔۔؟“

”اڑے بابا۔۔۔ پتہ نہیں تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے، لگتا ہے آج کل تو زیادہ
بھنگ چڑھانے لگ گیا ہے۔“ جونگل خان غصے سے بولا۔

”اڑے بابا۔۔۔ یہ سب میں تمہارے چھوٹے سائیں کے بھلے کی خاطر کر
رہا ہوں۔۔۔ طاقت کے نشے اور ضد کے گھمنڈ میں آ کر انسان کبھی کبھی اپنے آپ کو
بڑا نقصان پہنچا دیتا ہے بس میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔“

”حاضر سائیں وڈا۔۔۔ برابر۔۔۔ برابر۔۔۔“ جبل ہاتھ جوڑتے ہوئے
بولا۔

اسی دوران ایک ملازم نے جونگل خان کو موبائل ہاتھ میں تھماتے ہوئے
بتایا۔

”بھوتار سائیں۔۔۔ احتشام صاحب کا فون ہے۔“
”ہالو بابا۔۔۔“ وڈیرا جونگل خان کی بات کو مکمل ہونے سے قبل ہی دوسری

طرف سے سعید احتشام بابر کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

”جونگل خان! میری بیٹی کو اغوا کرنے کا مطلب سمجھتے ہو تم۔۔۔“

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو شاید جونگل خان بھی اس کی بات کو مکمل نہ کرنے دیتا
مگر اس وقت سعید احتشام کے ان الفاظ نے ایک لمحے کے لیے جونگل خان پر
دفعۃً خاموشی طاری کر دی تھی، اسے اپنی سماعتوں میں احتشام کی پھنکاریں مارتی تیز

تیز سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی تاہم وہ ذرا سنبھلے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

”تم ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہو شاید۔۔۔ پھر بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر جونگل خان نے اپنا موبائل آف کر دیا۔ لیکن چند لمحوں بعد دوبارہ موبائل کی بیل پر اس نے اسے اپنے کانوں سے لگایا۔

”جونگل خان! چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میری بیٹی لیلی صحیح سلامت گھر نہ آئی تو تمہارے۔۔۔ بیٹے کو دنیا کا کوئی قانون پھانسی سے نہیں بچا سکتا۔“ حسب توقع دوسری جانب سے احتشام بابر کی ہانپتی کا نپتی آواز سنائی دی۔

جونگل خان اس بار اس کی آواز پر بھڑک اٹھا۔

”زبان سنبھال کر بات کرو احتشام۔۔۔! میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں مجھے صرف دوستی کا پاس ہے بس۔۔۔“

”دوستی اب رہی کہاں ہے جونگل خان۔۔۔!“

دوسری جانب سے احتشام بابر بھی اسی لہجے میں بولا۔

”تم دوستی کیا کرو گے جونگل خان۔۔۔! تمہیں تو دشمنی کا بھی سلیقہ نہیں آیا بزدلوں کی طرح عورتوں پر ہاتھ ڈال کر سمجھتے ہو کہ میدان مار لیا ہے۔۔۔“

”بس احتشام بہت ہو گیا۔۔۔ مجھ سے اس طرح گفتگو کر کے تم خود کو بہت بڑے جنجال میں ڈال رہے ہو، اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔۔۔“ جونگل خان سرسراتے ہوئے بولا۔

”پہلے تو تم اپنے آپ کو جنجال سے نکلانے کی کوشش کرو جونگل خان۔۔۔!“ سعید احتشام پاٹ دار آواز میں بولا۔

”وہ دور اور تھا جب اغوا جیسی وارداتوں کو معمولی سمجھا جاتا تھا۔۔۔ اب تو تم ایک غریب ہاری کی بھی لڑکی کو اٹھواؤ گے تو پھانسی کا پھندا تمہارا مقدر ہوگا۔ یہ تو پھر بھی

میری بیٹی ہے، سعید احتشام بابر کی۔۔۔ جو تلافی کی صورت میں موت سے کم سزا پر راضی نہ ہوگا۔۔۔“

”اڑے بابا۔۔۔! تم اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ سب میرے بیٹے خان محمد نے کیا ہے۔“ جونگل خان کو مصلحتاً دھیما ہونا پڑا تھا درحقیقت اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ جس بات کا اسے خدشہ تھا وہی ہو کر رہا۔ خان محمد نے جوش میں آ کر ایک ایسا انتہائی قدم اٹھا لیا تھا جس سے وہ خود بھی بہت بڑی مشکل میں پڑ سکتا تھا بلکہ پڑ چکا تھا اور اسی بات نے جونگل خان کو نرم پڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دوسری جانب سے سعید احتشام کی دوبارہ استہزائیہ آواز ابھری۔

”میں تمہارا کوئی ”ہاری“ نہیں ہوں جونگل خان! جو تم مجھے ان باتوں سے بہلا لو گے، میری طرف سے تمہیں چوبیس گھنٹوں کا الٹی میٹم دیا جاتا ہے۔ ورنہ اعلیٰ احکام سے میں تمہارے بیٹے کے خلاف ”ڈ۔تھ وارنٹ“ جاری کرادوں گا۔“

پھر دوسری جانب سے آواز آنا بند ہو گئی۔

جونگل خان دانت بھینچ کر رہ گیا، اسے سعید سے زیادہ اپنے بیٹے خان محمد پر طیش آ رہا تھا مگر پھر جلد ہی اس کا غصہ تشویش میں بدل گیا۔

”جبل۔۔۔!“ وہ دھاڑا۔

”حاضر سائیں وڈا۔۔۔“ جبل بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

”اڑے بابا۔۔۔ وہی ہونا جس کا ڈر تھا، تم فوراً خان محمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو اور اسے فی الحال حویلی آنے سے باز رکھنا، اس سے کہو کہ مجھ سے فون پر رابطہ کرے اور کوشش کرے کہ تر (اندر ونی زیریں علاقے) کی طرف نکل جائے، مجھے یقین ہے اس نے وہ بے وقوفانہ حرکت کر ڈالی ہے جس کا مجھے پہلے ہی سے خدشہ تھا۔“

”براہر سائیں۔۔۔۔۔“ جبل مختصر ا بولا۔

اس کے بعد جونگل خان بے چینی کے ساتھ ٹہلنے لگا اور بار بار اپنی مٹھیاں

اور دانت بچھنے لگا، وہ آج سے پہلے کبھی اتنا بے چین اور پریشان نہیں ہوا تھا مگر اس بار وہ خاصا بوکھلا گیا تھا، چند ٹاپے بعد وہ موبائل پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔

☆.....☆.....☆

لق و دق تپتے ریگستان کی بادِ سموم ماروی کے چہرے کو جھلسائے دے رہے تھی مگر وہ ان چیزوں کی کب پرواہ کرتی تھی۔

شام صحرائی ٹیلوں پر دھیرے دھیرے اپنی زلفیں بکھیر رہی تھی، ماروی کا اونٹ ذرا پرے تھوہر کے خشک جھنڈ سے بندھا ہوا تھا، وہ خود اس وقت سانول کی جھونپڑی کے بالکل قریب کھڑی تھی، اس وقت خلاف توقع سانول کی جھونپڑی میں ہجوم نہ تھا۔

ماروی ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی تھی، سامنے بوسیدہ سے مندے پر سانول اپنے گھٹنے سینے سے لگائے آنکھیں موندے پچل سرمست کی شاعری گنگنا رہا تھا۔

ہے غنیمت مجھ کو یارو، دوستی دلدار کی
کیوں نہ بیگانہ رہوں جب یہ جہاں فانی ہوا
سیکھے گا عشق جو بھی جھیلے گا وہ مصیبت

ماروی جیسے سردی سروں میں کھوس گئی۔ وہ چونکی اس وقت جب سانول نے اچانک اسے ”ماروی“ کہہ کر پکارا۔ ماروی نے جھک کر اپنی آنکھیں کھولیں۔ اسے عجیب سی مگر خوشگوار مہک کا احساس ہونے لگا۔

”ماروی دیکھ رہا ہوں میں تو کچھ زیادہ پریشان رہنے لگی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ سانول۔۔۔ تو نے میرے اندر عجیب سی جوت جگا دی ہے جو

آج مجھے مسرور بھی کرتی ہے اور مغموم بھی۔۔۔“

ماروی کے لہجے میں عجیب سا اعتراف تھا۔ وہ مزید بولی۔

”کبھی کبھی میں بے اختیار سی ہونے لگتی ہوں مگر جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے روایتوں کے ایسے بوسیدہ قلعے نظر آتے ہیں جو کسی بھی وقت میرے ناتواں کاندھوں پر آگرے گے اور میں ان میں دفن ہو جاؤں گی۔“

”محبت کرنے والے اتنے کمزور نہیں ہوتے ماروی۔۔۔!“ سانول اس کی بات سن کر جذب کی سی کیفیت میں بولا۔

اس کے جٹاؤں جیسے بالوں کے عقب میں ڈوبی ہوئی تیز مگر روشن آنکھیں ماروی کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور ماروی خود کو کسی انجانی گرفت میں محسوس کر رہی تھی، یہ کوئی نئی بات نہ تھی، اس جھونپڑی میں آکر کچھ ایسا ہی سحر اس پر طاری ہو جاتا تھا۔

”یہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا؟ اس کا کوئی تو نتیجہ نکلے یا پھر یہ سب کچھ تو چھوڑ دے میری خاطر۔۔۔ سانول۔۔۔!“ ماروی رسان سے بولی۔

سانول اسے چونک کر دیکھنے لگا پھر اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، اسی اثنا میں ماروی کو باہر کچھ لوگوں کی تیز تیز آوازیں آنے لگیں۔ ماروی ایک لمحے کو چونکی اور پھر سانول کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔

باہر گونڈھ کے کچھ لوگ جمع تھے اور عجیب سی نظروں سے ماروی کو دیکھے جا رہے تھے، ماروی نے ایک بیزار کن نگاہ ان پر ڈالی اور اس طرف چل دی جہاں اس کا اونٹ تھوہر کے جھنڈ سے بندھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ حویلی پہنچی تو اسے وہاں کی فضا ذرا بدلی بدلی سی محسوس ہوئی، حویلی کا ہر شخص اسے پریشان نظر آ رہا تھا اس کی ماں بھی خاصی فکر مند نظر آ رہی تھی۔

”کیا ہوا۔۔۔ امڑ (ماں) کیوں اتنی پریشان ہو۔“ اس نے سرسری لہجے میں ماں سے پوچھا۔

”بیٹی تمہاری سہیلی تھی نا۔۔۔ وہ۔۔۔ لیلی۔۔۔ اسے کسی نے اٹھا لیا ہے۔“

”کک۔۔۔ کیا۔۔۔؟“ ماروی کو جیسے اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگا۔
 ”اس کے باپ احتشام کا ابھی تھوڑی دیر پہلے فون آیا تھا۔“ اس کی ماں۔
 تفصیل بتانا شروع کی۔
 ”بہت غصہ کر رہا تھا۔۔۔ کہ اس کی بیٹی لیلیٰ کو ہم نے اغوا کر لیا ہے، اے۔
 خان محمد پر شبہ ہے۔“

”او۔۔۔ نو۔۔۔“ ماروی کے ہونٹ ازراہ تشویش سکڑ گئے۔
 یہ اچھا نہیں ہوا۔۔۔ امڑ۔۔۔ سعید احتشام کو یوں یکدم ایسا الزام نہیں لگا:
 چاہیے تھا۔۔۔“ پھر چند لمحوں وقف کے بعد اس نے اچانک پوچھا۔
 ”بھائی ویسے ہے کہاں۔۔۔ امڑ۔۔۔“
 ”یہی تو پتہ نہیں چل رہا۔۔۔“ اس کی ماں کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”اللہ خیر ہو دے۔۔۔ دھڑیں سائیں (اللہ سائیں) رحم کرے، میرے
 بچے پر۔۔۔“ اس کی ماں کے آنسو نکل آئے اور ماروی اسے کندھے سے لگا کر تسلیاں
 دینے لگی۔

☆.....☆.....☆

لیلیٰ کو ہوش آیا تو چند ٹاپے اس کے حواس متخل رہنے کے بعد دھیرے
 دھیرے بحال ہونا شروع ہوئے، تب اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ اسے اغوا
 کیا جا چکا ہے۔ اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے گھر
 سے نکلی اور ایک جیب اس کی گاڑی کے آگے آ کر راستہ روک کر کھڑی ہو گئی پھر اس
 میں سے چند ڈھانٹا پوش افراد اترے جنہوں نے اسے قابو کر لیا اور تب وہ ہوش و خرد کی
 دنیا سے کوچ کر چکی تھی۔ یہ سوچ کر پہلے تو اس کے اندر شدید غصے کی لہر سی اٹھی جو
 بتدریج بعد میں انجانے خدشات اور تشویش میں بدلتی چلی گئی۔

اس نے اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا، وہ ایک کچا مگر قدرے کشادہ

اور ہوادار کمرہ تھا، اونچی چھت کا یہ کمرہ گارے مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہاں موجود اشیاء
 میں ایک رلی کچھی چار پائی تھی جس پر وہ اس وقت بیٹھی ہوئی تھی جبکہ قریب ہی ایک
 پانی کا بڑا سا منکار رکھا ہوا تھا جس کے ڈھکنے کے اوپر جست کا ٹیڑھا میٹرھا گلاس بھی الٹا
 پڑا ہوا تھا کمرے کی کل کائنات بس یہی تھی اور ایک جگہ دیوار پر قدرے بلند روشندان
 تھا جہاں سے شام کے اندھیروں میں ڈوبتا ہوا آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ اندر روشنی کا
 کوئی بندوبست نہیں تھا، لیلیٰ کے محتاط ذہن نے آس پاس کے سنائے سے یہ اندازہ
 لگایا کہ یہ جگہ دور دراز کے علاقے میں تھی۔

اس نے اپنے مکے ہوئے کپڑوں کو درست کیا اور چار پائی سے نیچے اتر آئی
 اس نے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس کئے مگر اس نے پاس رکھے مکے کو
 ہاتھ نہیں لگایا، اس کے اندر غم و غصے کی ملی ملی کیفیات جنم لے رہی تھیں، وہ اندازہ
 لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر یہ گھٹیا حرکت کس نے کی تھی تب اسے اپنے والدین کا
 بھی خیال آیا جو اس کے یوں ناگاہ گم ہو جانے پر کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اس
 دوران اس کا خیال یونہی خان محمد کی طرف چلا گیا اور وہ چونک سی گئی، باہر فرارے دار ہوا
 چل رہی تھی پھر ٹھیک اسی وقت لیلیٰ نے جب کمرے کے اکلوتے دروازے کی جانب
 قدم بڑھائے تو اسے ٹھٹھک کر رکنا پڑا دوسری جانب کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری
 تھی۔

لیلیٰ کا دل دروازے کے باہر اچانک ابھرنے والی آہٹ پر زور سے دھڑکا
 تھا، وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ پر ساکت ہو چکی تھی، چند ٹاپے بعد کنڈا کھلنے کی کھڑ بڑ ہوتی
 رہی اس کے بعد کنڈا کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ بھی ہلکی چڑچڑاہٹ سے
 کھلتا چلا گیا اور اگلے ہی لمحے لیلیٰ سامنے مسکراتے ہوئے شخص کو دیکھ کر پہلے تو چونکی پھر
 اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔

”یہ۔۔۔ یہ تم ہو۔۔۔ مجھے پہلے ہی شک تھا۔“ لیلیٰ قدرے دانت پیستے

ہوئے بولی۔

سامنے خان محمد کھڑا تھا، سفید شلوار قمیض میں ملبوس، اس کے بائیں پہلو پر ہولسٹر بھی جھول رہا تھا۔

”ایسی گھٹیا حرکت۔۔۔ کر کے تم میری نظروں سے گر چکے ہو خان محمد۔۔۔!“ لیلیٰ پر بدستور غصہ سوار تھا۔

”مجھے ضرورت بھی نہیں ہے تمہاری نظروں میں مقام بنانے کی۔۔۔ تمہارا باپ خود کو بڑی اونچی شے سمجھتا تھا نا۔۔۔ اب پتہ چلے گا اسے۔۔۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ لیلیٰ برہمی سے بولی۔

”میرے ابو کا تمیز سے نام لو، تم کیا سمجھتے ہو خود کو۔۔۔ اپنی اوطاقوں میں غریب ہاریوں پر رعب جما کر تم لوگ اپنے آپ کو زیادہ طاقتور سمجھنے لگتے ہو۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔۔۔“ خان محمد زور سے دھاڑا۔ لیلیٰ کے نشتر بھرے جملے اسے اپنی سماعتوں کو چیرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”منہ سنبھال کر بات کرو، تم اپنے بابا کے گھر نہیں کھڑی ہو اس وقت۔۔۔“

”میں تو تمہیں اپنے بابا کے گھر میں بھی اس طرح للکار سکتی ہوں۔۔۔“

خان محمد لیلیٰ کے اس ترکی بہ ترکی جواب پر بھڑک اٹھا اور اگلے ہی لمحے کمرے کی ساکت فضا تھپڑکی ”چٹاخ“ اور لیلیٰ کی ”کراہ“ سے گونج اٹھی۔ خان محمد کے تھپڑنے لیلیٰ کا نازک گال سرخ کر ڈالا تھا، غصے اور بے بسی سے لیلیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اگر آئندہ اس قسم کی بکواس کی تو اچھا نہ ہوگا۔“ اتنا کہہ کر خان محمد واپس چلا گیا اور کمرے میں لیلیٰ کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

وڈیرا جونگل خان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے بیٹے کے خلاف اغوا کی

رپورٹ لکھی جا چکی ہے اور ایف آئی آر بھی کٹ چکی ہے مگر اسے پریشانی زیادہ اس بات کی ہو رہی تھی کہ اس کا ابھی تک خان محمد سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا اور نا ہی خان محمد نے خود کو کوئی ایسا قدم اٹھایا تھا، وڈیرا جونگل خان سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ جانے اس کا بیٹا کہاں اور کس حال میں ہوگا۔ دراصل جونگل خان چاہتا تھا کہ اگر خان محمد نے واقعی کوئی ایسا قدم نادانی یا جوش میں آ کر اٹھا بھی لیا ہے تو در بدر ہونے کی بجائے وہ اس کے ”پروں“ میں آ جائے، اسے خدشہ تھا کہ اگر پولیس سے اس کے بیٹے کا ”نکلوا“ ہو گیا تو صورتحال سنگین بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ سعید احتشام بابر کی پوزیشن اور حیثیت سے واقف تھا، خان محمد اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا ان کا۔۔۔ جونگل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے اتنے میں کمدار جیل سندھو نے ایک اہم اطلاع دی ”سائیں وڈا۔۔۔! چھوٹے سائیں کا پتہ لگ گیا ہے۔“ قادو یہ خبر لایا ہے وہ ادھر اوطاق میں ہے، بس آپ کو ساتھ چلنا ہے۔

”چلو۔۔۔ پھر جلدی۔۔۔“ وڈیرا جونگل نے گونجیلی آواز میں کہا۔

پھر وہ جیسے ہی باہر آ کر اپنی ”بکیر“ میں سوار ہونے لگا، اس کا ایک مصاحب خاص دوڑتا ہوا وہاں آن پہنچا، اس کے چہرے سے بدحواسی ہوید اٹھی، وہ پھولی ہوئی سانسوں کے بیچ بمشکل بولا۔

”سس۔۔۔ سائیں وڈا۔۔۔ قہر ہو گیا۔۔۔“

”اڑے بکواس کر جلدی۔۔۔ ہوا کیا ہے بابا۔۔۔“ جونگل خان غصے سے بولا۔

”سس۔۔۔ سائیں۔۔۔ بھوتار۔۔۔ چھ۔۔۔ جھلگری آیا ہے۔“

”یہ منحوس اس وقت کیوں آن ٹپکا۔“ جونگل خان نخوت سے بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے، اسے وہاں رکھو ذرا۔۔۔ میں بعد میں ملونگا اس سے۔۔۔“

جونگل خان جب بجیر میں سوار ہونے لگا تو وہ مصاحب خاص دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”سائیں۔۔۔ وہ بہت زخمی ہے اور اس کی حالت بھی بہت خراب ہو رہی ہے۔“

اس انکشاف پر جونگل خان بجیر میں سوار ہوتے ہوتے رہ گیا، چند لمحوں کی گہری سوچ میں ڈوب کر اس نے جبل سندھو کو پہلے جنگل ڈیرے کی اوطاق کی طرف چلنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب جونگل خان اوطاق میں پہنچا تو اندر چار پائی پر جھلگری کی حالت زار دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، اس کی دونوں گھنی بھنویں سکڑ کر آپس میں مل گئی تھیں اور نچلا ہونٹ بالائی دانتوں کی قطار تلے دب گیا تھا، جھلگری کی بیت کدائی دیکھ کر اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس جیسا عیار اور خطرناک شخص ایسی حالت کو بھی پہنچ سکتا ہے۔

جھلگری خون میں لت پت تھا، وہ شدید زخمی تھا جو اس بات کی غماز تھی کہ اسے گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ وڈیرا جونگل خان کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ جھلگری کا یہ حال پولیس مقابلے میں ہوا ہے۔ جبل سندھو اور قادیان اپنے اوپر قبر کی سی خاموشی طاری کئے غم صم کھڑے تھے، جبل سندھو۔۔۔ اگر گھوڑا زخمی ہو جائے تو کیا کرتے ہیں۔“ جونگل خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”جی۔۔۔ جی سائیں۔۔۔“ جبل سندھو کے الفاظ اس کے حلق میں ہی ایک گئے۔

”بابا۔۔۔ پھر دیر کس بات کی ہو رہی ہے، جان چھڑاؤ اس سے۔۔۔ یہ اب کسی کام کا نہیں رہا ہے۔“ جونگل خان نے سفاکی سے کہا اور پھر اوطاق سے باہر آ گیا، ٹھیک اسی وقت اندر سے پستول چلنے کی آواز آئی اور اس نے معنی خیز انداز میں

اپنا سر ہلادیا۔

وہ مطمئن تھا کہ جبل سندھو نے جھلگری کو ہراذیت سے دائمی نجات دلا دی تھی تاہم اسے تھوڑا قلق ہوا کہ اس کا ایک اہم مہرہ خود اس کے ہاتھ سے ضائع ہوا تھا۔ ابھی وہ جھلگری کی لاش کو ٹھکانے لگا ہی رہے تھے کہ جونگل خان کو سامنے ریت کا بادل سا اڑتا ہوا نظر آیا پھر بتدریج وہ بادل کئی چھوٹی بڑی گاڑیوں کے ایک کارواں میں بدلنے لگا اور اگلے ہی لمحے جونگل خان بری طرح ٹھٹھکا تھا کیونکہ وہ گاڑیاں پولیس اور رینجرز کی تھیں جو اسی جانب دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ جونگل خان شدید متذذب کا شکار دکھائی دے رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کی گاڑیاں وہاں پہنچ کر رک گئیں۔

پھر ایک جیپ سے ڈی ایس پی سبھا گو خان نیچے اترا، اس کا چہرہ گردوغبار سے اٹا ہوا تھا مگر جوش آنکھوں سے مترشح تھا، اس کے ساتھ دیگر پولیس اہلکار اور رینجرز کے جوان بھی نیچے اترا آئے تھے، ڈی ایس پی سبھا گو خان، وڈیرا جونگل خان کے قریب آ کر اسے کیڑے توڑنگا ہوں سے گھورنے لگا۔

وڈیرا جونگل خان کو جتنی جلدی تھی، اتنی ہی اسے دیر ہو رہی تھی سبھا گو خان کو اپنی جانب اس طرح گھورتے دیکھ کر اس کی طبیعت مقدری ہونے لگی تاہم اس نے اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

”اڑے بابا۔۔۔ تمہارا کام ہم نے کر دیا ہے، جاؤ اندر جھلگری کی لاش موجود ہے۔۔۔ لے جاؤ اور سرکار سے انعام پاؤ۔“

جونگل خان کا رعوت آمیز رویہ ڈی ایس پی سبھا گو خان کو کھلنے لگا، وہ ایک ایک لفظ کو چباتا ہوا بولا۔

”جونگل خان۔۔۔ جھلگری کا تمہارے پاس پناہ میں آنا تمہیں مشکوک بناتا ہے۔“

سبھاگو خان کے کرخت لہجے نے جونگل خان کے تن بدن میں آگ بھڑکا دی، اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب یہی سبھاگو خان اس کے آگے دم ہلایا کرتا تھا اور آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

”ہمارے ٹکڑوں پر منہ مارنے والے جب ہمارے آگے بھونکتے ہیں تو ہمیں انہیں اچھی طرح جواب دینا آتا ہے۔“

”جونگل خان۔۔۔! زبان سنبھال کر بات کرو۔“ ڈی ایس پی سبھاگو خان کرختگی سے بولا۔

”بدنام اور خونی ڈاکو جھلگری زخمی حالت میں یہاں تمہارے پاس کیوں آیا تھا اور تم نے اسے گولی کیوں ماری۔۔۔! اپنی پوزیشن واضح کرو جونگل خان۔۔۔!“

”اڑے بابا۔۔۔! صاف بات ہے، وہ ڈاکا ڈالنے یہاں آیا تھا اور ہم نے جان کے خوف سے اسے گولی ماری۔“ جونگل خان نے بظاہر لا پرواہی سے کہا مگر پھر جلد ہی وہ اپنے اس بچگانہ جواز پر ذرا گڑبڑا سا گیا۔

ڈی ایس پی اس کی بات سن کر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
”جونگل خان! جھلگری تو خود شدید زخمی تھا، اس کو تو اپنی جان کے لالے پڑ رہے تھے، وہ بھلا کیا ڈاکا ڈالتا اور وہ بھی بالکل تنہا۔۔۔ تم قانون کے سامنے جواب دہ ہو جونگل خان۔۔۔!“

”دیکھو سبھاگو خان۔۔۔! وڈیرا جونگل خان موقع کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے رویے میں ذرا لچک پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”تمہارا مقصد جھلگری کو جہنم واصل کرنا تھا، سو وہ پورا ہو گیا، مجھے اس وقت بہت ضروری کام سے جانا ہے، بہتر یہی ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔“

”تم جہاں جانا چاہتے ہو جاسکتے ہو مگر یہ یاد رکھنا کہ قانون کی نظروں میں تم مشکوک ہو گئے ہو۔“

سبھاگو خان کی بات سن کر وڈیرا جونگل خان ایک لمحے کو چونکا پھر چند لمحے سبھاگو خان کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، اس کے بعد اپنی بجیرہ کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

لیلیٰ اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہی تھی، خان محمد کے تھپڑ سے اب تک جلن محسوس ہو رہی تھی، وہ اس وقت کوکوس رہی تھی جب اس نے خان محمد جیسے بد قماش اور جاہل انسان سے روابط بڑھائے تھے، نا وہ اسے اتنا قریب کرتی اور نہ ہی آج اسے یہ دن دیکھنے پڑتے، وہ جن حالات سے گزر رہی تھی، وہ بالکل غیر یقینی تھے، کچھ پتہ نہ تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا تھا۔

لیلیٰ کو باہر خان محمد کے ساتھیوں کے ہولے ہولے تہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی اثناء میں دروازہ کھلا اور وہ یکدم سنبھل کر بیٹھ گئی، اندر آنے والا خان محمد تھا، اس کے چہرے پر دبی دبی مسرت سی پھوٹ رہی تھی۔ لیلیٰ خان محمد کو دیکھ کر ذرا چونکی تھی کیونکہ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں سرخ گونا گونا کناری والا بالکل دہنوں جیسا لباس تھا ما ہوا تھا۔ خان محمد کو دیکھ کر جانے کیوں لیلیٰ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا، خان محمد سرخ جوڑے کو لیلیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے خمار آلود لہجے میں بولا۔

”لیلیٰ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں، غصہ تھوک دو، لو یہ لباس پہن لو، ابھی اور اسی وقت تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

خان محمد نے جیسے دھماکہ کیا اور لیلیٰ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی، خان محمد کے لہجے کی لڑکھٹاہٹ اور اس کے منہ سے آنے والی شراب کی بدبو لیلیٰ کو ہولائے دے رہی تھی۔

”خان۔۔۔ خان محمد۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔ تم اپنے ہوش

میں نہیں ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ یہاں سے جاؤ۔۔۔ خدا کیلئے۔۔۔“ لیلیٰ چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کھپکھپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔
 ”تم صحیح کہہ رہی ہو لیلیٰ۔۔۔! تم ہو ہی اتنی حسین کہ تمہیں دیکھ کر میں واقعی ہوش میں نہیں رہتا۔“

وہ اپنی مست کلامی کے دوران آنکھوں میں نیلا پن لیے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور لیلیٰ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی، اس کا پورا جسم ٹھنڈے پسینے میں نہا رہا تھا اور اس کی آنکھیں انجانے خوف سے پھیلنے لگی تھیں۔

”لیلیٰ۔۔۔! مجھے معاف کر دینا، میں نے تمہارے اس پھول سے گال پر تھپڑ مارا۔ آؤ میں اس جگہ تمہیں۔۔۔“ وہ اس کے گال کو چھوتے ہوئے مستی میں بولا۔

لیلیٰ مارے خوف کے پیچھے ہٹتی جا رہی تھی پھر اس کی کمر دیوار سے جا لگی اور دونوں ہاتھ پھیل کر دائیں بائیں دیوار سے چپک گئے، اسے خان محمد بیٹھریے کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔

”ت۔۔۔ تم۔۔۔ چاہتے کیا ہو؟“ وہ گہرا کر بولی۔
 ”میں تمہیں چاہتا ہوں بس۔۔۔“ خان محمد جواباً مدھوشی سے بولا۔
 ”مگر یہ طریقہ غلط ہے۔“ لیلیٰ نے فوراً پینٹر بدلا۔ وہ جانتی تھی کہ خان محمد نشے میں ہے اگر اس کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی تو وہ مشکل میں پڑ سکتی ہے لہذا اس نے نرم رویہ اختیار کرنے کی ٹھانی۔

”تو تم صحیح طریقہ بتا دو۔۔۔ مگر ذرا جلدی۔۔۔“
 ”خان محمد۔۔۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔۔۔ میری عزت یوں تار تار نہ کرو۔۔۔ تمہاری بھی تو آخر بہن ہے۔۔۔ تمہیں اپنی بہن ماروی کا واسطہ۔۔۔“ یہی وہ لمحہ تھا جب خان محمد کی بے لگام پیش قدمی کو یکدم بریک لگ گیا، اس کا نشہ ہرن

ہونے لگا پھر لیلیٰ نے دیکھا کہ خان محمد جھنجھلا کر اس سے کافی دور جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔
 لیلیٰ نے دوبارہ کھنکھیاتے ہوئے کہا۔

”خان محمد مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔۔۔ پلیز۔۔۔“

خان محمد جواب کافی سنبھل چکا تھا بولا۔

”لیلیٰ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تمہارے باپ نے صاف انکار کر دیا، خود تم نے بھی انکار کیا تھا۔“

لیلیٰ کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ خان محمد ہوش میں آ چکا تھا، لہذا وہ بدستور ہموار لہجہ اپناتے ہوئے بولی۔

”نہیں خان محمد۔۔۔ ہم نے انکار تو نہیں کیا تھا، صرف سوچنے کا وقت مانگا تھا۔“

”جھوٹ بولتی ہو تم۔۔۔“ خان محمد غصے سے چلا کر بولا۔

”تم لوگوں کو یہی ضد ہے کہ ہم نے ماروی کا رشتہ تمہارے بھائی شکیل کے لیے منظور نہیں کیا، اس لیے اب تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہو مگر ایک بات یاد رکھنا لیلیٰ! کہ تم صرف اور صرف میری ہو، میں ابھی جا رہا ہوں، کل پھر آؤں گا اور میرے ہمراہ اور بھی لوگ ہوں گے جو ہمارا باقاعدہ نکاح پڑھائیں گے سچے۔“ خان محمد نے اتنا کہا اور دہنوں والا سرخ جوڑا چار پائی پر پھینکتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

اور لیلیٰ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی، وہ دانت پیستے ہوئے چار پائی پر پڑے سرخ جوڑے کو گھورے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سعید احتشام باہر کی حالت دیدنی ہو رہی تھی۔ وہ کبھی فون کی طرف بڑھتے تو کبھی قریبی صوفے پر براجمان روتی سسکتی اپنی بیگم کو دلا سہ دیتے، ان کا بیٹا شکیل بھی

اماں کے پاس موجود تھا۔

”تم حوصلہ رکھو، صوبے کی ساری انتظامیہ حرکت میں آ چکی ہے، بس ابھی اطلاع آنے والی ہوگی۔“ ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ یکدم فون کی بیل بجی اور سعید احتشام تیزی سے فون کی طرف لپکے۔

☆.....☆.....☆

”یار خانو۔۔۔ اب جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کر ڈالو۔۔۔ تاخیر ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتی ہے کیونکہ اس وقت پورے صوبے کی مشینری حرکت میں آ چکی ہے۔“ دادن، خان محمد سے قدرے تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے دادن میں آج ہی یہ قضیہ نپا دیتا ہوں۔“ خان محمد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اسی دوران ایک ساتھی اندر داخل ہوا وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا آتے ہی بولا۔

”کوئی گاڑی ہمارے فارم کی طرف آرہی ہے۔“

اس کی بات سن کر وہ ٹھٹھک گئے اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے پھر وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور کوٹھری نما کمرے سے باہر آ گئے، اس وقت سورج کی الوداعی کرنیں شام کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں، چاروں طرف دیرانہ پھیلا ہوا تھا اور جا بجا بھر بھری مٹی والے میدان پر کانٹے دار پودے اگے ہوئے تھے۔

دور سے انہیں گاڑی مٹی کے بادل اڑاتی ہوئی دکھائی دی پھر کوٹھری کی چھت پر موجود راتقل بردار نو جوان نیچے اتر کے ان کے قریب آیا، اس کے ہاتھ میں دو بیٹن تھے، وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

”خیر آ۔۔۔ گاڑی پولیس کی نہیں ہے۔“

خان محمد نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دو بیٹن اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اپنی آنکھوں سے لگالی اور اگلے ہی لمحے وہ خوشی سے بولا۔

”دادن۔۔۔ یہ بکیر و ہماری ہے۔۔۔ لگتا ہے بابا جانی آرہے ہیں ادھر۔۔۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔۔۔“ دادن اس سے دور بین لیتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا۔

”مگر انہیں یہاں کا کس طرح علم ہوا۔۔۔؟“ خان محمد قدرے حیرت سے بڑبڑایا۔

”ارے بابا وہ تمہارا باپ ہے آخر۔۔۔ اسے بھلا تمہاری فکر۔۔۔ تمہارے تحفظ کا خیال نہ ہو گا کیا۔۔۔؟“

گاڑی کا رخ ان کے فارم کی جانب ہی تھا، وہ قریب پہنچ کر رکی، اس کے بعد بکیر و کا دروازہ کھلا اور وڈیرا جونگل خان اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ نیچے اتر آیا۔

”سلام بابا جانی۔۔۔!“

”اڑے بابا۔۔۔ تو کب سے اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگا ہے۔۔۔“ جونگل خان اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ خان محمد خاموش کھڑا تھا۔

”تجھے معلوم نہیں میں نے تجھے اس جلد بازی سے روکا تھا۔ تو نے کسی ہماری کی بیٹی کو نہیں اغوا کیا ہے سمجھا تو۔۔۔“

”حیرت ہے بابا جانی۔۔۔! آپ بھی ایسی باتیں کر رہے ہیں آپ احتشام جیسے شخص سے ڈر رہے ہیں۔۔۔“ خان محمد کے خون نے بھی جوش مارا تھا۔

دادن اور اس کے دیگر ساتھی خاموشی کے ساتھ دونوں باپ بیٹوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔

”دل تو چاہتا ہے تجھے ایک چپاٹ (تھپڑ) رسید کر دوں۔۔۔“ جونگل خان قدرے درشتی سے بولا۔

”پر جوان اولاد پر مجھے ہاتھ اٹھانا اچھا نہیں لگتا۔۔۔“ وہ قدرے نرم پڑے ہوئے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھ میڈا پٹ۔۔۔! احتشام سے میں نہیں ڈرتا مگر تو نے اپنی نادانی میں آکر اسے بہت طاقتور بنا دیا ہے، تو سمجھتا کیوں نہیں۔ آج میری حیثیت وہ نہیں رہی ہے کہ ہم جو چاہیں وہ ہو جائے، میں سیاست سے آؤٹ ہو چکا ہوں مگر پھر بھی میں نے اپنی ذاتی حیثیت اتنی بنا رکھی ہے کہ کوئی ہم سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا مگر شاید اب تیری بیوقوفی کی وجہ سے مجھے جھکنا پڑ جائے۔۔۔“ اتنا کہہ کر جونگل خان خاموش ہو گیا۔ وہ قدرے ہانپنے لگا تھا، قریب کھڑے ایک محافظ نے اسے ٹھنڈے پانی کی چھال دی۔

جونگل خان نے پانی کے چند گھونٹ بھرے اور چھال قریب کھڑے محافظ کو تھادی پھر بولا۔

”اب جو ہوا اس پر مٹی ڈال۔۔۔ یہ بتا لیلیٰ تو ٹھیک ہے نا۔۔۔ وہ ہے تو ادھر ہی نا۔۔۔“

”ہاں بابا جانی۔۔۔ وہ ہمارے ہی پاس ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔“ خان محمد نے ہولے سے کہا۔

”چل میڈا پٹ۔۔۔! شاباش اسے میرے پاس لے کر آ۔۔۔ میں اسے خود احتشام کے گھر چھوڑ کر آؤں گا اور معاملہ یہیں رفع دفع ہو جائے گا۔“

خان محمد اپنے باپ کی بات سن کر بری طرح چونکا۔ اس نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر حیرت سے بولا۔

”بابا جانی۔۔۔! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، کہاں ہے لیلیٰ۔۔۔ اسے اسی وقت میرے حوالے کر دو۔۔۔“ جونگل خان کا لہجہ ایک دم تحکمانہ ہو گیا۔

خان محمد نے اپنے باپ کی بات سن کر ایک نظر قریب کھڑے داؤن کی طرف دیکھا جو خود خاصا پریشان اور متذبذب نظر آ رہا تھا پھر فیصلہ کن لہجے میں اپنے باپ سے بولا۔

”نہیں۔۔۔ بابا سائیں۔۔۔! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، میں جو قدم اٹھا لیتا ہوں اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔۔۔“

”اڑے بابا۔۔۔! میں تیرے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔۔۔“ جونگل خان بولا۔

”جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے۔۔۔ وہ انتہائی خطرناک ہے، اس میں تمہاری جان کو خطرہ ہے۔۔۔ میں تمہاری جان بچانا چاہتا ہوں۔۔۔“

”معاف کرنا بابا جانی۔۔۔! آپ کو میری جان نہیں اپنی ساکھ پیاری ہے۔“ بالآخر خان بد لے ہوئے لہجے میں بولا۔

”خان محمد۔۔۔!“ جونگل خان کو یکدم طیش آ گیا پھر جلد ہی وہ تحمل کی راہ اختیار کرتے ہوئے ملائمت سے بولا۔

”خان محمد۔۔۔! میری بات مان لے۔۔۔ اس میں تیرا ہی بھلا ہے، اب بھی وقت ہے لیلیٰ کو میرے حوالے کر دے۔۔۔“

”بس بابا جانی۔۔۔! اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔۔۔ کہ میں نے جو کچھ کیا درست کیا، میں لیلیٰ کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا، میں اس سے ہر قیمت پر شادی کروں گا، چاہے مجھے اس کے لیے زبردستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔۔۔“ خان محمد فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

اور اس سے پہلے کہ جونگل خان کچھ کہتا، کوٹھری کی چھت پر چڑھے ایک ساتھی نے چلا کر انہیں متوجہ کیا۔

”ہوشیار۔۔۔ پولیس آ رہی ہے۔۔۔“

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ یکدم وہاں افراتفری مچ گئی، خان محمد بھی ایک لمحے کو متوحش نظر آنے لگا پھر اچانک اس نے اپنے باپ جونگل خان کی طرف دیکھا اور پہلی بار اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کے لیے نفرت کی چنگاڑیاں سی سنگ اٹھیں۔

جونگل خان بھی موجودہ صورتحال سے بوکھلایا ہوا نظر آنے لگا۔
 ”بابا جانی۔۔۔! آپ سے مجھے ایسی بات کی ہرگز توقع نہ تھی۔“ خان محمد الفاظ چبا کر بولا۔

”کیا بکواس کر رہا ہے تو۔۔۔ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ پولیس کو میں یہاں لایا ہوں؟“ جونگل خان اس کی غلط فہمی پر بھڑک اٹھا تھا۔

ادھر دادن اور اس کے چند ساتھیوں نے اپنی رائفلیں وغیرہ تھام کر پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ دادن، خان محمد کے قریب آ کر ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”خانو۔۔۔! اندر آ جاؤ۔۔۔ یہاں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں۔“ مگر خان محمد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”دادن۔۔۔! ہمیں یہیں سے جلدی فرار ہونا ہے۔“
 ”یہ نہیں ہو سکتا خانو۔۔۔!“ دادن اس کی بات رد کرتے ہوئے بولا۔
 ”پولیس کی گاڑیاں بہت قریب آ چکی ہیں۔۔۔ ہمیں یہیں رہ کر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔“

”خانو۔۔۔! میری بات مان لے، اب بھی وقت ہے، لیلیٰ کو میرے حوالے کر دے۔۔۔“ جونگل خان مخدوش ہوتی ہوئی صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا اور پھر اس نے اندر کی جانب قدم بڑھائے مگر خان محمد یکدم باپ کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”آگے سے ہٹ جا خان محمد۔۔۔! میں لیلیٰ کو یہاں سے لے کر جاؤں گا یہ

تم سب کے حق میں بہتر ہوگا۔۔۔“ خان محمد اپنے بیٹے کو پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔
 ”بابا جانی۔۔۔! رک جائیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، میں لیلیٰ کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔۔۔ آپ اپنی ساکھ کی خاطر اپنے بیٹے کی خوشی کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔۔۔“

خان محمد کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا پھر وہ دوڑ کر اندر کوٹھری میں داخل ہو گیا اور بجلی کی سی پھرتی سے اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ باقی دیگر ساتھیوں نے بھی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں، جونگل خان اپنی جگہ تنہا ہکا بکا کھڑا رہ گیا، اس نے ایک نظر اپنے عقب میں ڈالی تو دنگ رہ گیا، پولیس کی بھاری جمعیت ایک بڑے کارواں کی صورت قریب سے قریب آتی جا رہی تھی، یہ دیکھ کر جونگل خان تیزی سے آگے بڑھا اور کوٹھری کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑاتے، وئے چیخ کر بولا۔

”خانو۔۔۔! تجھے ضرور میری طرف سے غلط فہمی ہوئی ہے اب بھی وقت ہے، باہر آ جا۔۔۔ تم لوگ پولیس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔۔ دیکھ میڈا پٹ۔۔۔! اپنے باوا جانی کی بات مان لے۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ بابا۔۔۔ پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔۔۔ لیلیٰ جب تک ہمارے قبضے میں ہے۔۔۔ آپ یہاں سے چلے جائیں بابا۔۔۔“ اندر سے خان محمد بھی چیختے ہوئے بولا تھا۔

”تو بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔۔۔ خانو۔۔۔! مان لے اپنے بابا جانی کی بات۔۔۔“ جونگل خان کی آواز اب نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

وہ آخر باپ تھا، اولاد کو خطرے میں گھرا دیکھ کر وہ حد سے زیادہ پریشان ہوا جا رہا تھا، اب اس کے چہرے سے کروفر اور دبدبہ عنقا ہو چکا تھا، اس کی جگہ اب بدحواسی اور بوکھلاہٹ نے لے لی تھی، اسے اتنا اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بے وقوف لڑکے۔۔۔ پولیس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اسی دوران پولیس کی بھاری جمعیت نے چاروں طرف سے فارم ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا۔

جونگل خان نے یہ دیکھا تو پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اسی جانب بھاگا جہاں ایس ایس پی میگا فون لئے کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ دیگر پولیس اہلکار بھی کھڑے تھے۔
”ٹھہرو۔۔۔ بابا۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔! میں اپنے پٹ (بیٹے) کو سمجھا رہا ہوں۔“ پھر اچانک اس کی نگاہ احتشام بابر پر پڑی۔ وہ بھی وہاں پہنچ چکا تھا، جونگل خان اسے دیکھتے ہی اس کی جانب بڑھا اور ملتجیانہ انداز میں بولا۔

”احتشام بابا۔۔۔! دیکھو میں اپنے بیٹے کو سمجھا رہا ہوں، تھوڑی مہلت تو ملے گی تا بابا۔۔۔! لیٹی میری بیٹی ہے، میں اسے حفاظت سے یہاں لے کر آؤں گا۔“
ایس ایس پی چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر احتشام بابر کی جانب دیکھا، احتشام کا خفیف سا اشارہ پا کر اس نے جونگل خان کو فارم ہاؤس میں جانے کی اجازت دے دی۔

”بہت مہربانی بابا۔۔۔ بڑی مہربانی۔۔۔!“ جونگل خان اجازت ملتے ہی جیسے بچوں کی طرح خوش ہو گیا، اس وقت اس کی حالت دیدنی ہو رہی تھی۔
جونگل خان تیز تیز چلتا ہوا کوٹھری کی جانب آیا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”خان محمد میڈا پٹ۔۔۔! دروازہ کھول دے، وہ دیکھ یہ سب تجھے مارنے کے لیے آگئے ہیں۔۔۔ میری۔۔۔ میری بات مان لے۔۔۔ تجھے کم سے کم سزا دلاؤں گا۔“

وڈیرا جونگل خان کا لہجہ دلوں کو کاٹ ڈالنے جیسا ہو رہا تھا، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی مطلق العنان شخص ہے جو اپنی اوطاق میں ناک پر کبھی تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا اور آج خستہ حال فارم ہاؤس کے قریب کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔

”بابا جانی۔۔۔! خدا کے لیے آپ بیچ میں نا آئیں۔۔۔“ چند ثانیے بعد اندر سے خان محمد کی آواز ابھری تھی۔

”مجھے کچھ نہیں ہوگا آپ آگے سے ہٹ جائیں ہم سب باہر آ رہے ہیں۔“
ادھر اب میگا فون پر خان محمد کو وارن کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے نیز جونگل خان کو بھی واپس پلٹ آنے کی تلقین کی جا رہی تھی۔
اسی اثناء میں دروازہ کھلا اور سب سے پہلے لیٹی برآمد ہوئی، وہ بہت سہمی ہوئی تھی، اس کیساتھ ہی خان محمد بھی نمودار ہوا کچھ اس طرح کہ اس نے لیٹی کی کپٹی پر پستول رکھ کر اسے ڈھال بنا رکھا تھا، ساتھ ہی اس کے دیگر ساتھی بھی بندوقیں تھامے باہر آ گئے تھے، ادھر پولیس نے بھی ایک دم پوزیشن سنبھال لی تھی۔

”خبردار۔۔۔ جو ہم پر کسی نے گولی چلائی ورنہ۔۔۔ اس لڑکی کو بھون دیا جائے گا گولیوں سے۔۔۔“ خان محمد اپنی جیب کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے چیخ کر پولیس والوں سے بولا۔۔۔ نہ صرف اس نے بلکہ اس کے ساتھیوں نے بھی لیٹی کو اپنی گنوں سے کور کئے ہوئے تھا۔

”ہمیں بآسانی یہاں سے نکلنے دیا جائے۔۔۔“ خان محمد کا دھمکی خیز رویہ کارگر ثابت ہوا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے پہلے تو میگا فون پر انہیں وارن کرنے کا اعلان ہونا ختم ہوا پھر پولیس نے اپنی گنیں نیچے جھکا دی تھیں۔

سامنے ذرا فاصلے پر کھڑے ایس ایس پی اور احتشام بابر کے چہروں پر ہیجان کی سی کیفیت تھی، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان سب کو گولیوں سے بھون ڈالیں۔ پولیس کی گھاگ نگاہیں سامنے ذرا فاصلے پر باپ، بیٹے کے درمیان ہونے والی جذباتی ٹکراؤ پر مرکوز تھیں۔ وڈیرا جونگل خان متوحش اور بدحواس سا ہوا جا رہا تھا اور اپنے بیٹے خان محمد کو اس خطرناک اور مجرمانہ اقدام سے روکنے کی سعی کر رہا تھا، وہ خان محمد کے ساتھ ساتھ ہی سرکتے ہوئے اس کی منتیں کرتا جا رہا تھا۔

یہ خان محمد کے لیے انتہائی خطرناک سچویشن تھی جس کا غالباً اسے خود بھی اندازہ تھا، وہ چلا چلا کر اپنے باپ کو پرے ہٹنے کا کہہ رہا تھا۔

”بادا جانی۔۔۔! آپ ہمارے راستہ سے ہٹ جائیں، آپ نہیں جانتے آپ کی وجہ سے ہم خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔“

”رک جامیڈا پٹ۔۔۔! رک جا۔۔۔ میں تجھے اتنا بڑا قدم اٹھانے نہیں دوں گا۔۔۔“ وڈیرا جونگل خان پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔

پھر معاً وہ کچھ ہو گیا جس کی شاید خان محمد کو توقع نہ تھی مگر پولیس اسی موقع کی تلاش کی منتظر تھی۔

جونگل خان نے اچانک خان محمد کے ریوالور پر ہاتھ مارا اور کمال پھرتی سے لیلیٰ کو اس کی گرفت سے چھڑا کر اپنے قبضے میں کر لیا، یہ سب آنا فانا ہوا تھا، خان محمد پر تو جیسے سکتا طاری ہو گیا تھا، اس کا ریوالور ہاتھ سے نکل کر اب جونگل خان کے ہاتھ میں آچکا تھا جو اس نے اپنے بیٹے پر تان لیا تھا۔

خان محمد اور اس کے ساتھی ایک دم ہراساں نظر آنے لگے تھے کیونکہ انہوں نے لیلیٰ کو ٹارگٹ بنایا ہوا تھا اور اب وہ سب خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔

”خبردار۔۔۔! جو لیلیٰ کو ہاتھ لگایا تو۔۔۔“ جونگل خان پستول بیٹے پر تانتے ہوئے بولا۔

صورتحال بہت سنگین اور عجیب ہو گئی تھی۔ خان محمد کی آنکھوں میں شعلے رقصاں ہو چکے تھے، وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ یہ سب کچھ اپنی ساکھ کے لیے کر رہا ہے مگر حقیقتاً یہ بات قطعی نہیں تھی، جونگل خان کو اپنے بیٹے کی زندگی عزیز تھی کہ یہ معاملہ یہیں سلجھ جائے مگر اس کا نادان اور ضدی بیٹا اپنے باپ کو ہی اپنا دشمن سمجھ جا رہا تھا۔

ادھر پھرتی کے ساتھ پولیس نے اپنی گنوں کا رخ سیدھا کر دیا تھا۔ جونگل

خان نے اپنے بیٹے پر ریوالور تانا ہوا تھا مگر خان محمد کو یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس پر گولی چلائے گا لہذا بلا خوف و خطر اس نے اپنے باپ کو ایک زور سے ٹھوکر ماری مگر خود اس کا پاؤں بھی رپٹ گیا جس کی وجہ سے وہ ریوالور اور لیلیٰ کو اپنے قبضے میں نہیں کر سکا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ لیلیٰ اور جونگل خان دونوں ہی زمین پر آ رہے، لیلیٰ کے حلق سے تیزی چیخ برآمد ہوئی، پہلے وہ بھر بھری زمین پر چاروں شانے چت گری اور اس کے اوپر جونگل خان آ پڑا۔ اب لیلیٰ کافی حد تک جونگل خان کے بھاری بھر کم وجود تلے چھپ کر رہ گئی تھی اور جیسے ہی لیلیٰ گن پوائنٹ سے آؤٹ ہوئی پھر کسی کو بھی کچھ سوچنے کا موقع نہ ملا، فضا میں جو سنسنی خیز تناؤ رچا ہوا تھا، وہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں تبدیل ہو گیا، یہ فائرنگ پولیس نے اپنے افسر کے مخصوص اشارے پر خان محمد اور ان کے ساتھیوں پر کی تھی۔

فارم ہاؤس کی بھر بھری زمین پر کئی جسم اذیت ناک چیخوں کے ساتھ لہرائے اور پیوند خاک ہونے لگے ان میں وڈیرا جونگل خان کا بیٹا خان محمد بھی تھا جو گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔

فضا میں بارود کی ناگوار سی بو پھیل چکی تھی۔ فائرنگ نے جونگل خان پر سکتہ طاری کر دیا، خان محمد اور ان کے ساتھیوں کو جہنم واصل کرتے ہی پولیس والے جونگل خان اور لیلیٰ کی طرف دوڑے پھر گرم صم جونگل کو ایک طرف کر کے لیلیٰ کو فوراً اپنی حفاظت میں لے لیا، لیلیٰ اس ماحول کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی جسے اس کے باپ سعید احتشام باہر نے سنبھال لیا۔

وڈیرا جونگل خان کی حالت دیدنی ہو رہی تھی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے خاک نشیں بیٹے خان محمد کو تنکے جا رہا تھا پھر وہ دیوانوں کی طرح چلاتا ہوا احتشام کی طرف بڑھا مگر راستے میں ہی پولیس کے اہلکاروں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

”اڑے بابا۔۔۔ یہ کیا کر دیا۔۔۔ میڈا۔۔۔ ہیرے جیسا پٹ مار دیا۔۔۔ نابابا۔۔۔ یہ ٹرائل کے خلاف ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ بھی تم لوگوں کے خلاف۔۔۔!“

وڈیرا جو نگل خان کی آواز جیسے اندر ہی گھٹ کے رہ گئی اور وہ غش کھا کر سپاہیوں کی بانہوں میں جھول گیا۔

☆.....☆.....☆

قرمزی پتھروں والی حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا حویلی کے بڑے سے احاطے میں صف ماتم پچھی ہوئی تھی، خان محمد کی رسم کل پڑھی جا رہی تھی۔

فضا میں اگر بیٹوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی، زنان خانے میں عورتوں کے رونے کی آوازیں وہاں موجود ہر ذی نفس کا دل چیرے دے رہی تھیں، گوٹھ کی عورتیں کیا، مرد کیا، سب کی آنکھیں پر نم اور چہرے سو گوار تھے، ان میں دور نزدیک کے عزیزو اقارب بھی شامل تھے، مردانے میں دعائیں پڑھی جا رہی تھیں اور لوگ ایک طرف بچھے مندے کے نیچے حسب روایت اور حسب حیثیت ”عذر خوی“ کے طور پر روپے رکھ کر اور بآواز بلند ”حکم اللہ جو“ (حکم اللہ کا) کہہ کر واپس اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے تھے۔

وڈیرا جو نگل خان ایک کمرے میں زندہ لاش کی مثل پڑا ہوا تھا، اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور جسم کا دایاں حصہ بالکل مفلوج ہو چکا تھا، اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور زبان نکل کر ہونٹوں کے کناروں پر آ کر جھول گئی تھی، وہ صرف دیکھ اور سن سکتا تھا مگر ہلنے چلنے اور بات کرنے سے یکسر قاصر تھا۔ وہ ظلم کے انجام کی تصویرِ عبرت بنا ہوا تھا۔

اندر زنان خانے میں ماروی، ماں کو جو نیم بے ہوشی کی حالت میں بار بار غش کھائے جا رہی تھی سنبھالے ہوئے تھی اور ایک معروف لیڈی ڈاکٹر اسے مسکن آور

انجکشن دے رہی تھی۔

اچانک مردانے میں ہلکا سا شور سنائی دیا۔

”بھٹ سائیں آیا۔۔۔ بھٹ سائیں آیا۔۔۔“ مردانے سے آنے والی آوازوں سے ماروی کے سامنے نوجوان دیوانے مجذوب سانول کی شبیہ گھوم گئی مگر وہ چپ سادھے غمگین بیٹھی رہی۔

سانول وہاں آیا اور دعائیں شامل ہوا اور پھر اسی خاموشی کے ساتھ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر چلا گیا پھر وہ واقعی وہاں سے چلا گیا کہیں دور۔۔۔ کسی کو بتائے بغیر۔۔۔ حتیٰ کہ ماروی کو بھی نہیں۔۔۔ پھر گوٹھ کے لوگوں نے کبھی اسے وہاں نہیں دیکھا اس کی جھوپڑی کی جگہ تھوہر کے کانٹے دار پودے اگ آئے تھے۔۔۔ لوگوں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ تھوہر کے پودوں پر اکثر نذرانے کے طور پر کچھ نہ کچھ رکھ جاتے تھے۔

پھر ایک دن اداس اداس سی ماروی بھی وہاں آن پہنچی تھی، اس نے سانول کی جھوپڑی کی جگہ تھوہر کے کانٹے اگے دیکھے تو نجانے کیوں اسے یہ صحرابڑا ہر جائی اور بڑا ظالم محسوس ہو رہا تھا، اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور شاید وہ تھوہر کے پودوں کو اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ کئی روز بعد کا ذکر ہے کہ ماروی اپنی ماں کے ساتھ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بارگاہ پر حاضری دینے آئی تو معاً اس کی نگاہ ایک فقیر منش شخص پر پڑی اور بری طرح چوگن گئی، وہ سانول تھا جس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح بند تھیں اور وہ شاہ سائیں کی کوئی نظم گنگنا رہا تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر تھا۔

”سانول۔۔۔“ ماروی نے اپنے دل پر قابو پاتے ہوئے اسے پکارا، اس

کی آواز پر سانول نے یکدم اپنی آنکھیں کھول دیں، ایک نظر ماروی کو دیکھا اور شناسائی کی ایک لہر اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں دوڑی اور پھر دوبارہ اس کا چہرہ پرسکون ہو گیا، وہ اسی طمانیت سے ماروی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”ماروی۔۔۔! میری محبت کو امر کر دے۔۔۔ میری محبت کو۔۔۔ امر کر دے۔۔۔ اسے جگ کی ہنسی نہ بنا۔۔۔ ہم اب بھی اسی جگہ کھڑے ہیں۔۔۔ جہاں پہلے تھے۔۔۔ کچھ نہیں بدلا۔۔۔ سب ویسا ہی ہے۔۔۔ کوئی امید کوئی آس نہ رکھ۔۔۔ ورنہ پاکیزگی کو داغ لگ جائے گا۔“

پھر وہ ”حق اللہ۔۔۔ حق اللہ“ کہتا ہوا احاطے کی دوسری جانب چلا گیا اور ماروی پر نرم نگاہوں کے ساتھ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆